رموزِ تصوّف

فرمودات

حضرت مولانا غُلام ربانیؒ

مرتب۔

صاحبزادہ ابوذر غفاری دامت برکاتہم

ادارہ بلاغ الناس

طالبِ دُعا۔

سید محمد انور شاہ

Mobile # 0342-5559888
0344-5559888
Email # shahpk82@yahoo.com

فہرست

پیش لفظ

دُنیا ۔ حیاتِ اخروی اور دارین میں حصولِ فلاح و کامرانی کا ذریعہ ہے ۔ یہ دار العمل ہے تاکہ دائمی زندگی کا سامان فراہم کیا جائے ۔ خوش نصیب ہیں وہ پاکباز شخصیات جنھوں نے پوری زندگی اپنے خالق و مالک کی مرضیات کے مطابق بسر کی ، اور سفرِ آخرت اختیار کرتے وقت اعمال صالحہ کی وہ شمع روشن کر گئے جس کی ضوفشانی اور جلا افروزی سے زندگی کے راستے جگمگا رہے ہیں ۔

برادر محترم سید محمد وکیل جیلانی بھی انہی اصحابِ خیر اور صالح افرادِ ملّت سے تھے جن کے وجودِ خاکی کا اگرچہ اس دنیائے فانی میں وجود نہیں ہوتا مگر ان کے نیک کاموں ، اچھے کارناموں ، اور صدقاتِ جاریہ زندہ جاوید ہوتے اور قائم رہتے ہیں اور وہ نیک کام ان کی زندگی کا ثبوت ہوتے ہیں

سید محمد وکیل جیلانی کی زندگی کے آخری ایام حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی طباعت و اشاعت اور حضورؐ کی نعت و مدحت میں بسر ہوئے اور اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالْخَوَاتِیْم کے مصداق یہ ان کا سامان مغفرت اور توشۂ آخرت ہے ۔

جیلانی صاحب نے "چہل حدیث مبارکہ" کی اشاعت میں منفردانہ حیثیت اختیار کی کہ عربی متن کا ترجمہ مختلف زبانوں (اردو، فارسی، پنجابی، سندھی، پشتو، گجراتی، بلوچی، براہوی وغیرہ) میں کرا کے خوبصورت اشاعت کا اہتمام کیا ۔ نیز حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی ۶۳ برس کی عمر کی مناسبت سے ۶۳ نعتیں لکھ کر اظہارِ عقیدت و سامان مغفرت فراہم کیا ۔ (یہاں پر اس بات کا تذکرہ بھی مناسب ہے کہ وقت وفات خود جیلانی صاحب کی عمر بھی ۶۳ برس تھی ۔ سانحہ ارتحال جو آناً فاناً اور اچانک وقوع پذیر ہو ذہن اسے آسانی سے قبول نہیں کرتا ۔ یہی صورت الحاج سید محمد وکیل جیلانی کے واقعۂ رحلت کی ہے ۔ چند روز قبل ہی تو میں نے بمعہ سلیم بھٹی اور میاں محمد سلیمان ، سید ضیاء الدین شاہ صاحب کے دولتکدہ پر ان سے ملاقات کی تھی وہ بالکل تندرست اور بخیریت تھے اور انھوں نے اپنی مسحور کن آواز میں اپنی نعت " روضۂ اطہر میرے نبی کا سبحان اللہ سبحان اللہ " سنائی تھی ۔ دوسرے روز میں گاؤں چلا گیا واپس آیا تو ضیاء الدین شاہ صاحب نے ٹیلیفون پر جیلانی صاحب کی وفات کی روح فرسا خبر سنائی ۔ دل کو ایک دھچکہ لگا اور سخت صدمہ ہوا ۔ یقیناً وہ وقت مقبولیت دعا کا ہو گا جب انھوں نے یہ شعر کہا تھا

جو عشقِ محمدؐ میں جیلانی آئے ۔ خدا سے میں ایسی قضا چاہتا ہوں

چنانچہ وہ جلد ہی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ۔

میری ملاقات جیلانی صاحب مرحوم سے اس وقت ہوئی جب چند سال قبل قبلہ حضرت والد صاحب مولانا غلام ربانی مدظلہ کی خدمت میں ان کی آمد و رفت شروع ہوئی تھی لیکن جلد ہی ہم ایک دوسرے سے ایسے مانوس ہوگئے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ مرحوم پہلی مرتبہ حاضر ہوکر ہی مولانا کی بیعت سے مشرف ہوئے اور حلقۂ ارادت میں شامل ہوگئے۔ انھیں اپنے پیرو مرشد سے گہری عقیدت و محبت تھی اور حضرت بھی ان سے بے انتہا محبت کرتے تھے جس کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جب بھی شاہ صاحب مرحوم آتے حضرت صاحب خواہ کیسی ہی تکلیف میں ہوتے انھیں "ملاقات کے لیے بلالیتے" اور فرماتے "شاہ صاحب شکر ہے آپ کو دیکھ لیا ہے" حضرت مولانا نے انکا ذوق وشوق دیکھ کر تھوڑے ہی عرصہ میں انھیں اپنی خلافت عطا فرمادی۔

شاہ صاحب مرحوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا عشق تھا اور اسی جذبہ کے تحت انھوں نے رسول پاکؐ کی عمر مبارک کی مناسبت سے ۶۳ نعتیں اور ۶۳ ہی قطعات کہے ہیں جو انشاء اللہ جلد ہی زیور طباعت سے آراستہ ہو جائیں گے۔

مرحوم و مغفور جیلانی صاحب اپنے پیرو مرشد کے ارشادات و فرمودات کی نشر و اشاعت کو ایک سعادت خیال کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت کی دو منظوم تصانیف "صبغۃ اللہ" اور "تمنائے حج" شائع کرا چکے ہیں۔ انھوں نے حضرت والد کی تصوّف پر اس تصنیف "رموزِ تصوّف" کی کتابت شدہ عبارت کو بنظرِ غائر اور نہایت عرق ریزی سے مطالعہ کرکے غلطیوں کی اصلاح کی اور اس کا ایک دیدہ زیب سرورق تیار کرایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

شاہ صاحب مرحوم بہت ہی خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت ادیب، عالم، شاعر، سیاسی کارکن اور مدبر سیاستدان تھے وہ خلوص کے پیکر تھے اور مجسمۂ شرافت، ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی اور خوش خلقی سے پیش آتے تھے۔ دل میں کسی کے خلاف کوئی میل نہ رکھتے تھے۔ صحافت کے میدان میں روزنامہ "پیغام" فیصل آباد، ساہیوال ان کی زندہ جاوید نشانی ہے جو ان کے فرزندان سید شبّیر جیلانی، سید منیر جیلانی اور سید تنویر جیلانی کی زیر سرپرستی نکل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ شاہ صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے (آمین)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

ہر چیز کی کوئی نہ کوئی تعریف ہوتی ہے اس کے بغیر کوئی شے علم انسانی میں مکمل نہیں کہلائی جاسکتی۔ لفظ تصوّف سے انسانی ذہن میں ایک تجسّس پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان یہ جاننا چاہتا ہے کہ تصوّف کیا چیز ہے؟ یہ کون سا علم ہے؟ اور اس کی ابتدا کب اور کہاں سے ہوئی؟ انسانی مادۂ تجسّس کی تسکین اور اطمینان کے لئے سب سے پہلے تصوّف کی تعریف اور اس کی ابتداء کے بارے میں جاننا نہایت ضروری ہے۔

تصوّف کے لغوی معنی ہیں دھیان دینا، ایک طرف چلنا۔ در اصل تصوّف اللہ تعالیٰ سے لو لگانے کا ایک علم ہے۔ تصوّف کے اصطلاحی معنی ہیں کہ قرآن وسنّت کی روشنی میں ایسی زندگی بسر کرنا، ایسے مشاغل اختیار کرنا اور تصوّرات، تفکرات، ذکر وفکر، مجاہدات اور عبادات کا ایک ایسا لائحہ عمل اپنانا جس کے ذریعے تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور تجلیۂ روح حاصل ہو۔

تصوّف کی جامع تعریف شیخ الاسلام حضرت زکریا انصاری نے اس طرح کی ہے:۔

"تصوّف وہ علم ہے جس سے تزکیۂ نفوس، تصفیۂ اخلاق اور تعمیرِ ظاہر و باطن کے احوال کا علم ہوتا ہے۔ تاکہ سعادت ابدی حاصل کی جاسکے"

تصوّف کی تعریف میں حضرت ابوالحسن نوریؒ یوں فرماتے ہیں:۔

"اَلتَّصَوُّفُ هُوَ الْحَرِّيَّةُ وَالْفَتَوَّةُ وَتَرْكُ التَّكَلُّفِ وَ وَالسَّخَاءُ وَ بَزْلُ الدُّنْيَا۔"

یعنی "تصوّف نام ہے نفس اور حرص و ہوا کی غلامی سے آزادی پانے کا، باطل کے مقابلہ میں جرأت و مردانگی دکھانے کا۔ دنیوی تکلّفات کو ترک کر دینے کا، اپنے مال کو دوسروں پر صرف کر دینے کا اور دنیا کو دوسروں کے لئے چھوڑ دینے کا۔"

تصوّف کے متعلق حضرت جنیدؒ نے یہ فرمایا ہے :۔

"اَلتَّصَوُّفُ هُوَ تَصْحِيْحُ الْخَيَالِ

یعنی پاک کرنا اپنے قلوب کو کدورات و خیالاتِ غیر اللہ سے"

صاحبِ کتاب حضرت مولانا غلام ربّانی مدّظلہٗ کے نزدیک تصوف کی تعریف :۔

"تصوّف وہ علم ہے جو دل سے ماسوا اللہ کو نکال دیتا ہے اور صاحبِ تصوّف کا دل یادِ الٰہی سے جوڑ دیتا ہے۔ یادِ الٰہی کے سوا دنیا کی کوئی چیز دل میں قیام نہیں کر سکتی۔ اگر صفات سے ذات کی طرف توجہ کی جائے تو یہ تصوّف ہے اور اگر ذات سے صفات کی طرف رجوع کیا جائے۔ تو یہ ایمان ہے۔"

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یاب ہونے والے افضل لوگ صحابی کہلاتے تھے۔ ان حضرات کو کسی دیگر لقب یا اعزاز کی ضرورت ہی نہیں تھی کیوں کہ ان کے لئے صحابیت سے بہتر کوئی فضیلت نہ تھی۔ جن بزرگوں کو صحابہ کرام کی صحبت نصیب ہوئی وہ تابعین کہلائے اور جنہیں تابعین کی صحبت حاصل ہوئی انہیں تبع تابعین کہا جانے لگا۔ تبع تابعین کا زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ عام مسلمانوں کے طور طریقے بدلنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں بدعات کا ظہور ہونے لگا۔ اور ہر کوئی اپنے اپنے زُہد و تقوی کا

دعویٰ کرنے لگا۔ زمانہ کے یہ انداز دیکھ کر خواص اہلسنت نے جو اپنے قلوب کو حق تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتے اور اپنے نفوس کو خشیّتِ الٰہی سے مغلوب دیکھتے تھے ابنائے زمانہ سے علیحدگی اختیار کرلی۔ ان ہی بزرگوں کو صوفیاء کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ اور ہر صاحب تصوّف صوفی کہلایا۔ سب سے پہلے صوفی کا لقب ابوالہاشم محمد بن احمدؒ کو دیا گیا۔ ان کا سنِ وصال ۱۰۶۱ ہجری ہے۔

صوفیاء نے مقامِ احسان میں اجتہاد کرکے علمِ تصوّف کی بنیاد رکھی۔ جس کی منزل صرف رضائے ذاتِ الٰہی ہے۔ اس ذات کے رمُوز کو سلوک کہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جو بھی مجاہدے، ریاضتیں اور مراقبے کرائے جاتے ہیں ان کا مقصود صرف اصلاحِ نفس ہے۔ تاکہ یہ انانیّت، تکبّر اور سرکشی سے پاک ہو جائے اور شریعت کے احکام پر چلنے میں اسے کوئی امر مانع نہ ہو، یہی طریقت ہے۔ اصل میں شریعت اور طریقت ایک ہی چیز ہے۔ البتہ طریقت، شریعت کے تابع ہے۔ بالفاظ دیگر وہ انداز اور طریقے جن سے حضوریٔ حق حاصل ہو، طریقت ہے۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ اپنی کتاب "اَلسِّرُّ الْجَلِیُّ فِیْ ذِکْرِ الْخَفِیِّ" میں لکھتے ہیں کہ حضورِ حق کے حصول کے لئے سلسلۂ نقشبندیہ میں تین طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ ذکر ہے۔ یعنی کلمہ طیّبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی تکرار کرے، نفی میں تمام مخلوق کی عدم و فنا کی نظر سے مطالعہ کرے اور اثبات میں وجودِ معبودِ حقیقی کو قدم اور بقا کی نظر سے مشاہدہ کرے۔ کلمۂ شریف کی تکرار کے وقت زبان کو تالُو سے لگائے، دِل صنوبری جو قلبِ حقیقی سے منعلق ہے کے ساتھ متوجہ ہو، سانس روک کر پوری قوت کے ساتھ اس طرح ذکر کرے کہ اس کا اثر دل تک پہنچے اور قلب اس سے متاثر ہو۔

دوسرا طریقہ توجہ اور مراقبہ ہے۔ جو اسم مبارک اللّٰہ کو بلا واسطہ

عباراتِ عربی و فارسی و عبرانی ملاحظہ کرے۔ تمام مدارک اور قوتوں سے قلبِ صنوبری کی طرف متوجہ ہو جائے اور اس طریقہ پر مداومت کرے، اس کی نگہداشت میں کوشش کرتا رہے۔ یہاں تک کہ یہ بے تکلف پیدا ہو جائے اور پھر کوشش کی ضرورت نہ رہے۔ سالک میں یہ بات جذبہ حاصل ہونے سے پہلے پیدا ہونی دشوار ہے۔ اس لئے سالک کو چاہیئے کہ معنیٔ مقصود جو ایک نور کی شکل میں بسیط اور تمام موجوداتِ علمی و عینی کو محیط ہے کا تصور کرے اور پوری ہمت و طاقت کے ساتھ قلبِ صنوبری کی طرف متوجہ ہو حتیٰ کہ صورت درمیان سے اُٹھ جائے اور مقصود حاصل ہو جائے۔

تیسرا طریقہ پیر کا رابطہ ہے۔ ایسے پیر کا دیدار جو مقامِ مشاہدہ تک پہنچا ہؤا ہو اور تجلّیاتِ ذاتیۂ حق سبحانہٗ تعالیٰ سے متصّف ہو اور حسبِ مقولہ :
اِذَا رَاَوْهُ ذَكَرُوْ اللّٰهَ (یعنی جب اس کی زیارت کرے تو اللہ یاد آجائے) اور اس کا رابطہ ذاکر کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ اور اس کی صحبت بمصداق (كُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ) مصاحبت حق سُبحانہ تعالیٰ کے ثمرات مرتب کرتی ہے۔ اگر ایسے پیر کامل کی دولت صحبت حاصل ہو جائے اور اس کا اثر سالک میں نمودار ہو تو اسے حتی الامکان محفوظ رکھے۔ اور اگر اثر میں کمی پیدا ہو تو اس کی صحبت کی طرف پھر رجوع کرے۔ یہاں تک کہ یہ کیفیت سالک کا ملکہ ہو جائے۔

موجودہ دور میں اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ تصوّف کے موضوع پر آسان، عام فہم، سلیس، سیدھے سادھے اور واضح الفاظ میں ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس سے عامۃ المسلمین بھی مستفیض ہو سکیں۔

رفیق محترم محمد سلیم بھٹی کا معمول تھا کہ وہ حضرت مولانا غلام ربانی مدظلہ العالی کی خدمت میں حاضری کے دوران حضرات کے فرمودات اکثر ایک کاپی میں قلمبند کر لیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ ایک دن شیخ الحدیث

حضرت مولانا نور محمد مرحوم اسلام آباد سے حضرت صاحب کی خدمت میں تشریف لائے۔ حضرت کے فرمودات کا یہ مسوّدہ ان کی نظر سے گذرا، مرحوم نے اسے کتابی شکل میں شائع کرنے پر زور دیا۔ چونکہ اس میں عربی عبارات و اصطلاحات اور ربط مضمون کا مسئلہ تھا۔ اس لئے حضرت صاحب کی اجازت سے مسوّدہ محترم ڈاکٹر فیضان دانش پروفیسر گورنمنٹ کالج باغبانپورہ لاہور، جو مشہور شاعر اور ماہرِ لغات جناب احسان دانش مرحوم کے صاحبزادے اور حضرت صاحب کے محبوبین میں سے ہیں، کے سپرد کر دیا گیا۔ الحمد اللہ ان کی کاوش سے یہ مرحلہ طے ہؤا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

حضرت صاحب کے فرمان کے مطابق بندہ حاجی میاں سلمان صاحب اور محمد سلیم بھٹی صاحب کی رفاقت میں حضرت صاحب کے خلیفۂ مجاز الحاج محترم سید محمد وکیل جیلانی چیف ایڈیٹر روزنامہ پیغام فیصل آباد کی خدمت میں حاضر ہؤا اور مسودہ جات کی اصلاح و نظرِ ثانی اور طباعت کی ذمہ داری ان کے سپرد کی۔

سید محمد وکیل جیلانی اور ان کے برادر بزرگ سید محمد جمیل جیلانی ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر حضرت صاحب کے خلفاء اور حلقۂ محبوبین میں سے ہیں جو حضرت صاحب کی دو منظوم فارسی کتب "صبغۃ اللہ" اور "تمنائے حج" شائع کر چکے ہیں۔ انہوں نے مسودہ کتاب ہٰذا کے ہر لفظ، ہر فقرے اور ہر سطر کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا۔ انتہائی غور و فکر سے زبان اور کتابت کی اغلاط کی تصحیح، عربی عبارت کی صحت اور دیگر اصلاح کے علاوہ فقروں کا آسان و عام فہم ربط، عبارت اور تحریر کی سلاست و روانی کو جس انداز سے پیشِ نظر رکھا اور فہرست مضامین کی ترتیب، کتابت شدہ مسوّدہ کی دوبارہ درستی و اصلاح، عربی متن کی دوبارہ کتابت غرضیکہ کتاب کی تزئین و تدوین اور اس کی طباعت کیلئے جو تگ و دو اور انتظام و انصرام کیا وہ انتہائی محنت و کاوش اور جانفشانی کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ

اسے شرف قبولیت سے نوازے اور ان دونوں حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے اور اپنی عافیت کے سایہ میں رکھے۔

کتاب کی اشاعت کے اخراجات کے سلسلہ میں جناب مقبول احمد نقشبندی اور جناب محمد طارق نے جو مالی اعانت فرمائی۔ اس کے لیے یہ دونوں حضرات شکریہ کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر عطا فرمائے۔

کتابت کیلئے جناب   کی کاوش، اغلاط کی درستی کیلئے جناب محمد سعی مرزا و جناب حافظ محمد امیر کی اپنی بساط کے مطابق معاونت، باقی ماندہ اغلاط کی اصلاح کیلئے جناب محمد امین کی مساعی، مختلف عربی عبارات کی دوبارہ کتابت کیلئے جناب منشی علم الدین کی مہارت اور معیاری طباعت کیلئے جناب   مالک   کی خصوصی توجہ کا بھی ممنون ہوں۔

کتابت شدہ مسودہ کی پروف ریڈنگ کے وقت الفاظ کی موزونیت اور فقرات کے تسلسل کے پیش نظر اکثر جگہ کتابت شدہ الفاظ کاٹنے پڑے۔ بدیں وجہ عبارت کے درمیان جو خلا رہ گیا ہے وہ ایک مجبوری تھی۔ لہٰذا قارئین حضرات اس خلا کے بارے میں یہ تصوّر نہ کریں کہ یہاں سے کوئی لفظ یا جملہ حذف شدہ ہے اگر کسی صاحبِ علم کو دورانِ مطالعہ کوئی سہو، سقم یا غلطی نظر آئے تو ازراہِ کرم احقر کو مطلع کر کے ممنون فرمائیں۔ انشاء اللہ طبع ثانی میں اس کی تصحیح کر دی جائے گی۔

سید الانبیاء نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے یہ کتاب حضرت مولانا غلام ربانی مدظلہ العالی کیلئے مزید قرب الٰہی کا سبب بنے اور اللہ رب العزت آپ پر اپنی بے پایاں رحمتوں اور مزید نوازشوں کا سلسلہ جاری رکھے اور عامۃ المسلمین کتاب ہٰذا سے مستفیض ہو کر دارین میں فلاح و کامرانی حاصل کریں۔

احقر العباد

صاحبزادہ ابو ذر غفاری نقشبندی مجددی

(ایم اے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تصوّف

تصوّف | **اَلدِّیْنُ الْخَالِصْ** تصوّف کے معنی ہیں ظاہر کو شرعی طور پر ناجائز چیزوں سے صاف کرنا، صفائیٔ باطن، دل کو صیقل کرنا، سچ کو عادت بنالینا اور جھُوٹ سے نفرت کرنا نیز اخلاص کو شعارِ حیات بنالینا وغیرہ۔ چند الفاظ میں تصوّف کا ماحصل یہ ہے کہ بندگی کے جس پہلو میں سُستی اور بے رغبتی محسوس ہو اسے چیلنج سمجھ کر مُقابلہ کیا جائے اور نفس جس گناہ پر مُصر ہو یا جس معصیت کا تقاضا کرے، اس کا مَردانہ وار مقابلہ کیا جائے۔

لطیفہ | جسمِ انسانی میں وہ مخصوص مقام جہاں ذکر کا ادراک ہو۔ لطیفہ کہلائے گا۔ وہ دقیق المعنی اشارہ جس کو الفاظ میں من و عن بیان کرنا محالات میں سے ہو مثلِ ذوقی علوم کہ الفاظ اس کی جُزئیات اور اصل کیفیت کو بیان کرنے میں عاجز ہیں ہاں انہیں محسوس کرنیوالا محسوس تو کر سکتا ہے مگر بیان نہیں کر سکتا۔

لطائف | لطائف دو قسم کے ہیں ایک کا تعلّق عالمِ امر سے ہے جبکہ دوسرے کا تعلّق عالمِ خلق سے ہے یہ دونوں قسم کے لطائف پانچ پانچ قسموں پر مبنی ہیں۔

لطائف عالمِ امر | لطائف عالمِ امر کی جڑیں عرش کے اُوپر ہیں اور جسمِ انسانی میں ان کے مختلف ٹھکانے ہیں۔ یہ لطائف قلب(۱) و روح(۲) و سِر(۳) و خفی(۴) و اخفیٰ(۵) ہیں۔

لطائف عالمِ خلق | لامسہ(۱)، ذائقہ(۲)، شامّہ(۳)، سامعہ(۴) اور باصرہ(۵)۔ یہ عالمِ خلق سے ہیں۔ تحت الثریٰ سے عرش کے اُوپر تک عالمِ خلق ہے۔ اور عرش سے اوپر یعنی لامکان تک عالمِ امر ہے۔ حواسِ خمسہ میں جو نور ہے وہ ہر احساس کا منبع ہے، اس نور کا نام ہے لطیفہ،

یعنی ایک لطیف نُور جو ادراک سے ماوریٰ ہے، اس کا اثر انسان کے باطن میں محسوس تو ہوتا ہے مگر الفاظ اسے بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

انسانی جسم میں دس مقامات ایسے ہیں جہاں ایسا ہی ایک نُور رواں دواں ہے۔
گیارہواں لطیفہ، لطیفۂ نفس ہے اور اس کا مقام ناف کے نیچے ہے۔

مقاماتِ لطائف لطیفۂ قلب۔ قلب کے اندر۔ لطیفۂ سِرّی سینہ کے درمیان۔ لطیفۂ رُوحی۔ داہنی طرف

پستان کے نیچے دو انگلی کے فاصلہ پر۔ لطیفۂ اخفیٰ۔ پیشانی میں یا دماغ میں، بہرحال سر اس کا احاطہ ہے لطیفۂ خفی۔ ہونٹوں کے درمیان ہے۔ اِسکا نام ہے حقیقتِ جامع انسانیہ۔

قلب کا معنی بدلنا۔ جو چیز اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر ہوتی ہو۔ اور یہی وہ قلب ہے جو اللہ تعالیٰ کے امر سے ہدایت بھی قبول کرتا ہے اور ضلالت بھی۔ اللہ تعالیٰ قلب اور انسان کے درمیان ایک مانع ہے۔ لطیفۂ قلب کا نور اصلی اور ذاتی ہے جبکہ دیگر لطائف کا نور فروعی ہے۔ ذہن نشین رہے کہ یہ گوشت والا دلِ اصلی نہیں ہے بلکہ یہ مظہر ہے۔ اصلی دل ارادۂ امکانی اور ارادۂ امری ہے۔

وَلَا تُطِعۡ مَنۡ اَغۡفَلۡنَا قَلۡبَهٗ عَنۡ ذِكۡرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ اَمۡرُهٗ فُرُطًا

ایکیلے ارادے کی دو طرف توجّہ ہے، ایک توجّہ الی اللہ ہے جس کا ثمرہ حسنات، عبادات، خوف اور اُمید ہے اور دوسرے توجّہ الی الھوا یعنی نفس کی طرف متوجّہ ہونا جس کا ثمرہ تکبّر، عُجب، ریا، سماعت، اشاعت، شخصی جاہ و جلال، بغض، حسد، نمائش غرور اور جائز و ناجائز کی عدمِ تمیز وغیرہ۔ پس انسان پر اس قلبی ارادہ پر قبضہ کرنا اور ناجائز امور سے بچنا اور اسے جائز امور کی طرف متوجّہ کرنا لازم ہے۔ اس کی توفیق فقط اللہ ہی سے مانگنی چاہیئے۔ نفس اور شیطان کا علاج بغیر فضلِ خداوندی ممکن نہیں حقیقت میں اور ظاہر میں شریعت ہے۔ جس کام کو شریعت نے جائز کیا ہے اس پر عمل کرنا اور جو کام شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے، اس سے بچنا۔ یہ ہے نگہبانی

وقت اور پاسبانیٔ قلب۔ یہ ہر انسان پر لازم ہے اور اسی چیز کا نام بندگی ہے۔

زندگی آمد برائے بندگی ÷ زندگی بے بندگی شرمندگی (حضرت رومیؒ)

نفس اپنی خوشی سے راہِ راست پر نہیں آتا بلکہ اس کو تکلیف دے کر سختی سے حق کی طرف لایا جاتا ہے۔ اسے ہی قوّتِ ارادیہ قلبیہ کہتے ہیں اور اس کا دار و مدار اس نیّت پر ہے جو خیر پر مبنی ہے (الاعمال بالنیّات) ہر عمل کی ایک ابتداء ہوتی ہے اور ایک انتہا۔ ابتدائے عمل نیّت ہے اور انتہائے عمل "حضور" اور یہی مقصود ہے۔ پس اصلاحِ نیّت اور حضورِ ذات، لوازمِ بندگی سے ہیں۔ یعنی اللہ ہی کے لئے نیک عمل کرنا اور اللہ ہی کے لئے بُرے اعمال سے بچنا۔ اور طالبِ حق کو چاہیئے کہ وہ دعا کے وقت اپنا دھیان حضورِ ذات باری تعالیٰ پر رکھے اور یہ سوچے کہ اس رحمٰن کی رحمت نے اسے گھیر رکھا ہے اور قانونِ شرعِ محمدیؐ بھی یہی ہے کہ جو کام کیا جائے انسان اس کی ابتداء و انتہا اس قانون کی روشنی میں دیکھ لے اگر اللہ کے لئے ہے تو کرے ورنہ چھوڑ دے (یہی اخلاص ہے) قلب سے یہ ارادے کا تصرّف ہے جو اعضاء تک چلتا ہے اور اعضاء کا تصرّف اعمال تک چلتا ہے۔ اور اصل عمل عملِ نیت ہے۔

احوالِ لطائف

۱۔ لطیفۂ قلب لطیفۂ قلب کا کام ذکر کرنا ہے۔ ذکر کے معنی ہیں یاد خواہ دُنیاوی کام کی ہو یا اُخروی کام کی۔ قلب کا خاصّہ ہے۔ یاد رکھنا اور دھیان کرنا، تصوّر کرنا، حضوری میں رہنا، حاضر رہنا، شاہد رہنا، غائب نہ ہونا، متفکّر رہنا، خائف رہنا، پُر امید رہنا لطیفۂ قلب ہیں زبانِ دل کے ساتھ جس کا مقام بائیں پستان کے نیچے دو اُنگلی کے فاصلے پر ہے۔ نُور اس کا سُرخ ہے۔ اسمِ ذات باری تعالیٰ **اللہ** کہا جاتا ہے، اور اس کے معنی پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے (یعنی وہ ایک ایسی ذات مُبارکہ ہے جو تمام اوصاف کاملہ کے ساتھ موصوف ہے اور ہر قسم کے نقائص سے پاک ہے اور اسی پر ہمارا تکیہ ہے) ہر وقت

اس ذکر پر مداومت کی جائے اور دل کی زبان کو اسم ذات باری تعالیٰ سے تر رکھا جائے تاکہ قلب اس ذکرِ عظیم کے ساتھ جاری ہو جائے۔

۲- لطیفۂ رُوح اس کا مقام دائیں پستان کے نیچے دو انگلی کے فاصلے پر ہے۔ حیاتِ قلبی کا یہی باعث ہے۔ اس کے آثار ذکری، فکری، سروری حضوری مدرک ہیں چنانچہ یہ قلب کے ساتھ متعلق ہے اور امری طرف قدرتِ کاملہ کے تصرف میں ہے بے کیف ہے اور اس کا نور فرو عی ہے اور رنگت میں یہ نور سفید ہے۔

۳- لطیفۂ سِرّی اس کا بنیادی کام مکاشفہ ہے۔ اس میں چیزوں کے رازہائے سربستہ کھُلتے ہیں۔ اسرار دعلوم تکوینیہ، کونیہ، قاضیہ، اس کے ذریعے قلب پر نازل ہوتے ہیں اور قلب سے بیان تک آتے ہیں۔ ان کا کیف غیر مدرک ہے۔ اس کا نور بھی فروعی ہے۔ بعض محققین نے لکھا ہے کہ طالبِ حق کو چاہیئے کہ وہ خیالی طور پر اپنے لطیفۂ سِر کو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے لطیفۂ سِر کے سامنے لائے اور خیالی طور پر ہی اس طرح عرض گزار ہو کہ اے اللہ ان شیونِ ذاتیہ کی تجلیات کا فیض جو تُو نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لطیفۂ سِر سے حضرت موسیٰؑ کے لطیفۂ سِر میں القا فرمایا ہے۔ پیرانِ عظام کے سلسلہ کے طفیل میرے لطیفۂ سِر میں القا فرما دے۔ رنگت میں اس کا نور سبز ہے۔

۴- لطیفۂ خفی اس کا بنیادی کام مشاہدہ ہے۔ اس کا مقام دائیں پستان کے برابر سینے کی جانب دو انگلی کے فاصلے پر ہے۔ یہ لطیفہ خفی امری کہلاتا ہے۔ اس کے آثار ذکری مدرک ہیں اور اسکی اصل نوری قوت لطیفہ بے کیف ہے یہ آثار بقدرِ ظرف عطا ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کسی کو اجمالاً معلوم ہوتے ہیں کسی کو حسًا کسی کو تفصیلاً اور کسی کو کشفاً۔ رنگت میں اس کا نور نیلگوں ہے۔

۵- لطیفۂ اخفیٰ اس کا بنیادی کام معائنہ ہے۔ جس طرح ہم عام چیزوں کو ظاہر با ہر دیکھتے ہیں ایسے ہی اللہ تعالیٰ کی ذات کو بلا کیف دیکھنا یہ مقام الیقان ہے اور مقام ایمان ہے یہ مقصود ہے اور متعلق مع اللہ ہے ان کا صوری

کمال تکمیلِ شریعت ہے معنوی کمال استحضارِ ذات ہے ان کا معاون ذکرِ اسمِ ذات ہے چاہے ذات کا حضور ہو یا اسم کا حضور ہو۔ اسم کے حضور میں برکت ہے اور ذات کے حضور میں وصل اور قرب ہے اہلِ حضور لوگ ہمیشہ متوجہ الی اللہ رہتے ہیں یہی ذات کا کمال ہے یہی انتہائے عبادت جس کو حضور حاصل ہو گیا اس کے سب مراحل آسانی طے ہو گئے۔ اور جسے حضوری حاصل نہیں وہ ابھی مقامِ مقصود میں ہے اس کا مقام وسطِ سینہ ہے ذکر کرے اس حد تک کہ پانچوں لطیفے ذکرِ الٰہی کے ساتھ جاری ہو جائیں۔ اس کے نور کو آنکھ کی سیاہی سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔

لطیفہ نفس اس کا مقام ناف کے نیچے ہے۔ بعض بزرگوں نے اس کا مقام پیشانی کے درمیان بتایا ہے اور اس کے نور کی رنگت زرد ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ مکیؒ "ضیاء القلوب" میں راقم ہیں" سالک کو ان چھ لطیفوں کا یہاں تک ذاکر ہونا چاہیئے کہ خود ان کے ذکر سے واقف ہو جائے مرشد اس ذکر کو لطیفہ مریدین میں ڈالنے کی طرف توجہ کرے بارگاہِ الٰہی میں دعا کرے اور مرید سے زبان کو تالو سے لگا کے بغیر زبان ہلائے قلب سے اسمِ ذات ادا کرنے کو کہے خود ہمت سے توجہ کرے یعنی اپنے قلب کے منہ کو مرید کے قلب پر تصور کرے اور غیر خدا کے خیال کو اس کے دل میں آنے سے روک کر اس کے قلب کو اپنی طرف جذبۂ قلبی سے مائل کرے تا کہ اس توجہ کے اثر سے اس کے لطیفہ میں حرکت پیدا ہو اور ذکر جاری ہو جائے اسی طرح ایک گھنٹہ سے کم و بیش مرید کی طرف متوجہ رہے اور خیال کرے کہ یہ تصرف جو مجھ کو حاصل ہوا ہے بزرگانِ سلسلہ کی اعانت اور توجہ سے ہے ——— **فائدہ** قلب صنوبری قلب حقیقی (جو عالمِ امر سے ہے) کا نشیمن ہے اور اسے حقیقتِ جامع بھی کہتے ہیں۔ یہ خدا کی عادت جاری ہے کہ جب مرید اپنے قلب کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو مبداءِ فیض سے قلبِ حقیقی کے واسطے اس کو فیض پہنچتا ہے۔ جب لطیفہ قلبی کی مشق کامل ہو جائے اور فناءِ قلبی حاصل

ہو جائے تو باقی لطائف کی الگ الگ مشق کرنی چاہیئے فنائے لطائف یہی ہے کہ لطیفے میں مستغرق ہو جائے لطیفۂ روحی تک لا کر اِلَّا اللہ کی دل پر اس طرح ضرب لگائے کہ اس کا اثر تمام لطیفوں پر پہنچے غیر اللہ کی نفی اور خدا کی ذات کے اثبات کا تصوّر کرے اس میں تکلیف کی ضرورت نہیں ہے۔ کبھی مرید پر لطیفہ میں انوار و تجلّیاں ظاہر ہوتی ہیں ایسی حالت میں اس کو ان میں محو نہ ہونا چاہیئے بلکہ خدا کے منزہ اور پاک۔ ہونے کا خیال کرنا چاہیئے

لطیفۂ قلبی میں نفی و اثبات صغیر بھی تعلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آنکھیں اور ہونٹ بند کر کے سانس ناف کے نیچے سے نکال کر گلے تک پہنچا کر اللہ کو گلے سے پہلے ایک سانس میں ایک دفعہ کرے اور تدریجاً ترقی دیتا جائے یہاں تک کہ اکیس مرتبہ تک پہنچا دے لیکن طاق عدد کا اور مد و شد کا خیال رکھے تاکہ اثر ظاہر ہو اور اگر اثر نہ ہو تو یہ بے حاصلی کی دلیل ہے۔ پھر از سرِ نو شروع کرنا چاہیئے ذکر کا اثر یہ ہے کہ نفی کے وقت وجودِ انسانی کی بالکل نفی ہو جائے اور حالتِ اثبات میں جذباتِ الٰہی کا ظہور ہو۔ اس ذکر میں ایسا منہمک ہونا چاہیئے کہ خدا کا ذکر انسان کے دل پر غالب ہو جائے اور معشوق کا نام بھول کر جلوۂ معشوق میں محو ہو جائے۔ (کلیاتِ امدادیہ۔ ص ۱۸، ص ۱۹، مطبوعہ دیوبند)

لطیفۂ قلب حضرت آدمؑ کے قدم کے نیچے ہے۔ یہ مشرب آدمؑ ہے۔

لطیفۂ سِرّی حضرت نوحؑ و حضرت ابراہیمؑ کے قدموں کے نیچے ہے۔ یہ مشرب نوحؑ و ابراہیمؑ ہے۔

لطیفۂ روحی حضرت موسیٰؑ کے قدم کے نیچے ہے یہ مشرب موسیٰؑ ہے۔

لطیفۂ خفی حضرت عیسیٰؑ کے قدم کے نیچے ہے یہ مشرب عیسیٰؑ ہے۔

لطیفۂ اخفیٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے قدم کے نیچے ہے یہ مشرب محمدی ہے۔

جس مشرب کا اُوپر ذکر کیا گیا، اس کا ہم معنی لفظ ولایت بھی ہے اور ہم مشرب آدمؑ کی جگہ ولایت آدمؑ، مشربِ نوحؑ کی جگہ ولایتِ نوحؑ، مشربِ ابراہیمیؑ و مشربِ موسیٰؑ کی جگہ ولایتِ ابراہیمی و ولایت موسیٰؑ، مشربِ عیسیٰؑ کی جگہ ولایتِ عیسیٰؑ اور مشربِ محمدیؐ کی جگہ ولایتِ محمدیؐ کے الفاظ بھی استعمال کیئے جا سکتے ہیں۔

بارھواں لطیفہ **لطیفۂ قالبیہ** ہے جو تمام کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اسے حقیقتِ جامعہ، حقیقت النسانیہ اور ہیئتِ انسانیہ مع ترکیب روحی بھی کہتے ہیں اور اس طرح لطیفۂ قالبیہ کا ذکر سلطان الاذکار ہے جس سے انسان کے رُوئیں رُوئیں میں ذکر کی حرکت شروع ہوجاتی ہے اس کا مشہور نام سلطانِ ذکر ہے جس کا معنی تمام جسم کی ذکری حرکت ہے اور یہ حرکت جب شاہانہ انداز سے ہوتی ہے تو اس سے عالمِ صغیر (بدن) کی مثبت تعمیر ہوتی ہے۔

تمام جہان کو اگر عالمِ کبیر کا نام دے دیا جائے تو حضرت آدمؑ کے جسم کو جوہرِ عالم کبیر قرار دیا جائے گا اور ہر انسان کے جسم کو اسی نسبت سے عالمِ صغیر کہا جائے گا۔

قلب فنا اسے ولایتِ صغریٰ کہتے ہیں۔ قلب فنا کا یہ معنی ہے کہ ارادہ غیر اللہ سے منقطع ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو

قلب بقا اس کا معنی ہے مقصود کے پاس رہنا۔ مطلوب کے پاس رہنا۔ مقامِ رضا۔ مقامِ عبادتِ دائمہ اور ذکرِ دائمہ اس کا نام ہے ولایتِ کبریٰ۔ اس کے بعد **سیر**، سیرِ آفاقی ہے۔ یعنی جملہ اطرافِ دُنیا کی سیر۔ **سیرِ نفس** اس سے مُراد تقاضائے نفس سے گزرنا، خواہشات کو ترک کر دینا اور ناجائز تو در کنار، مشکوک سے بھی بچنا۔

حقیقتِ قرآن قرآن صفاتِ باری تعالیٰ سے ہے اور احکامِ خداوندی ہے اس پر عمل کرنا۔ اپنے طور طریقوں کو اس کے سانچوں میں ڈھالنا،

اس پر جزوی طور پر بھی اور کلی طور پر بھی ایمان رکھنا اور اس پر پختہ ایقان رکھنا ازبس ضروری ہے۔ اس طرح سے پھر ایک نور پیدا ہوگا جو استعدادِ اطاعت پر حاوی ہوگا اس کا تشریعی نام توفیق من اللہ ہے۔ توفیق کے معنی ہیں جائل اسباب ابد موافق مطلوب الخیر۔

حقیقتِ کعبہ

حقیقتِ کعبہ بھی صفات باری تعالیٰ سے ہے اس کی حقیقت اور اس کی صفات کی حقیقت ذات باری تعالیٰ ہے۔ وجودِ کعبہ اور قیام کعبہ لوگوں کے لئے دعوتِ ثواب و نجات ہے اور یہ سب رضائے الٰہی ہے۔ اس کے مناسک اور طواف، ذاتِ کبریائی اور عظمتِ خداوندی پر دلالت کرتے ہیں یہ مقبولیّتِ عبادت ہے حاجیوں کے لئے اور مقامِ اجابتِ دُعا ہے سبب نزولِ انوارِ تجلّیات ہے علاجِ گناہ اور دعوتِ مغفرت ہے اور مشرب و مذہبِ ابراہیمیؑ ہے۔

حقیقتِ صلوٰۃ

یہ مقام ولایت کا بڑا مقام ہے جو دال ہے۔ غایتِ عظمت اور کمالِ جلالت و جمالیت پر اور عبدیت کا مقام بندگی ہے۔ صلوٰۃ کا ہر رُکن مظہرِ عظمتِ خداوندی ہے جیسے قیام، مقامِ حضور، رکوع، مقامِ نیاز، سجود، مقامِ عبدیت و تنزل تلاوتِ سبق مقامِ راز اور مقامِ دعا دعوتِ الی اللہ اور دعوتِ من اللہ ہے رکعت کے معنی جز۔ رکوع بمعنی عاجزی، سجدہ بمعنی غایت عاجزی، قعدہ مقامِ استحضار من اللہ اور سلام پھیرنا دُعا ہے۔

حقیقتِ دعوت

یہ مقامِ مقبولیّت، مقامِ منظوریت اور مقامِ لیاقت و تعدد برائے ارشاد وغیرہ یہاں قوّتِ فیض اور قوّتِ توجّہ انتقالِ احوال یکے بعد دیگرے شروع ہوتا ہے۔ اس مقام پر صوفیا کرام مُریدوں کو خلافت عطا فرماتے ہیں۔

حقیقتِ شہود

یہ مقام حضور ہے، مقامِ معائنہ ہے، مقامِ مشاہدہ ہے مقامِ محبّت ہے، مقامِ عشق ہے، مقامِ طلب

ہے عبادت دوام ہے، قیام ریاضت ہے اور سبب اہتمام تصوّف ہے وغیرہ وغیرہ
شہود ایک ایسے حرف کی مانند ہے جو استعداد قابلیہ میں کھنچ جاتا ہے اسی حرف
کے ذریعہ استعداد میں توجہ الی اللہ پیدا ہوتی ہے اور ذاکر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے ذات
سے اور ذات سے توجّہ کرتا ہے صفات کی طرف۔ ذات سے صفات کی طرف توجہ کرنا فرض
اور صفات سے ذات تک جانا قربِ نوافل میں سے ہے کیونکہ صفات مقامِ معرفت ہے
اور معرفت کے ذریعہ معروف تک جانا یہ ایک نفلی چیز ہے ذات کی طرف توجہ کرنا
پھر صفات کی طرف آنا، یہ فرائض میں سے ہے۔ ذات کے ساتھ رہنا یعنی حضور میں رہنا
فرض ہے۔ یہ مقامِ عروج ہے۔

حقیقتِ حیرت

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ۔ مقامِ حیرت ہے کہ ذات کا چون،
ذات کا گون، ذات کا اندازہ، ذات کی حد اور ذات
کے ساتھ وصل، قُرب، بُعد کا علم، انسانی ادراک سے باہر ہے۔ یہ کمالِ معرفت
کا مقام ہے اس مقام پہ ذات بے کیف بے این، بے چون اور بے گون کی محب
و عاشق بن جاتی ہے یہ محبت محض قوّتِ ایقانی ہے جو ارادہ قوی اور عزم پختہ کا جوہر تصرفی
ہے۔ ذات کے متعلق ایقان میں تصوّر کرنا بلاکیف بلامثل اور بلاطرف، عبادت
ہے۔ یہی دین ہے اور یہی ایمان ہے۔ حیرت اللہ تعالیٰ کے افعال اور صفات میں وارد
ہوتی ہے ذات میں حیرت کُفر ہے اور منع ہے۔ مخلوق میں یہ قوّت انسان کے علاوہ
کسی اور میں نہیں۔ یہ ایک خصوصی صفتِ انسانی ہے جو عطائے الٰہی ہے۔ یہ ذوقی چیز ہے
انسان اس کی بدولت مسلمان ہوتا ہے۔ اسی کا نام عقیدہ ہے یہ نُورِ یقین کے ساتھ تعلّق
رکھتا ہے جو اندرونِ قلب ہے اس کا مقام سویدا ہے جو قلب کے جوفِ یمنی کے راست
کی طرف ہے۔ یعنی داہنی طرف ہے۔ واللہ اعلم

حقیقتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم

حقیقت محمدی برزخ کبری ہے اور روح اعظم ہے یہ اوّل خلق ہے اور سب مخلوق سے اوّل ہے۔ اَنَا مِنْ نُورِ اللّٰہِ وَخَلقَ مِنْ نُوْرِی (حدیث رسولؐ)

حقیقتِ محمدی تمام عالم کے لئے رحمت ہے اور مادہ کثرت ہے۔ اگر حقیقتِ محمدی نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ زمین اور آسمان پیدا ہی نہ کرتا۔ یہ سب ہمارے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض ہے جو عالمِ شہود میں اور عالمِ ظہور میں آگیا۔ یہ ناسوتی تمام ہے جو جسم مبارک کا نام ہے یہی وہ اسم مبارک ہے جو مجموعہ احکام خداوندی ہے اور یہی وہ اسمِ مبارک ہے جو عالم سفلی کیلئے منبع فیض ہے اور باعثِ تخلیق ہے۔ دلائل الخیرات کی درج ذیل عبارت کا اشارہ اسی طرف ہے۔

وَبِالْاِسْمِ الَّذِیْ وَضَعْتَہٗ عَلَی اللَّیْلِ فَاَظْلَمَ وَعَلَی النَّھَارِ فَاسْتَنَارَ وَعَلَی السَّمٰوٰتِ فَاسْتَقَلَّتْ وَعَلَی الْاَرْضِ فَاسْتَقَرَّتْ عَلَی الْجِبَالِ فَرَسَتْ وَ عَلَی الْبِحَارِ فَجَرَتْ وَعَلَی الْعُیُوْنِ فَنَبَعَتْ وَعَلَی السَّمٰوٰتِ فَأَمْطَرَتْ۔

اے خدا اس نام کا واسطہ جسے تم نے رات پر رکھا تو وہ تاریک ہو گئی۔ دن پر رکھا تو وہ روشن ہو گیا زمین پر رکھا تو اسے قرار آگیا پہاڑوں پر رکھا تو وہ گڑ گئے۔ سمندروں پر ڈالا تو وہ بہنے لگے، چشموں پر ڈالا تو وہ پھوٹ پڑے اور آسمانوں پر ڈالا تو وہ برسنے لگے۔

یہ اسمِ مبارک حتمی طور پر ہمارے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔

حقیقتِ احمدی

عالمِ علوی میں ہمارے آقا و مولا کا یہی نام یعنی اَحْمَدْ لیا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں کہ میرے بعد ایک نبی اور آئے گا جس کا نام اَحْمَدْ ہو گا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اہل زمین کے لئے مُحَمَّدْ ہے اور عالمِ بالا کی مخلوق آپکو احمدؐ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اور بلاشبہ یہی مظہرِ حقیقتِ خالق ہے۔

حقیقتِ معرفتِ صفات

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتِ معرفتِ صفات بیان کرنے سے پہلے کچھ باتیں اسمارِ حسنیٰ پر ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کے وہ مبارک نام جو قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر وارد ہوئے ہیں۔ یہ وہ اسمارِ عظیمہ ہیں جو مختلف زبانوں میں مختلف پیغمبروں کے مشاہدات کے نتیجے کے طور پر ظہور میں آئے۔ ہُوا یوں ہے کہ مختلف پیغمبروں کو جب مختلف مشاہدات حاصل ہوئے تو انہوں نے اپنے ان ذاتی مشاہدات کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کی ان صفات کی نمائندگی کے حامل اسمار بنائے۔ مثلاً حضرت آدمؑ نے جن اسرارِ الٰہیہ کا مشاہدہ کیا، اس کے مطابق ان کی زبان پر اسم "اللہ" جاری ہو گیا۔ اسی طرح حضرت ادریسؑ کی زبان پر ان کے ذاتی مشاہدات کے تحت علیم، قوی، عظیم، منّان وغیرہ اسمار مبارک وضع ہوئے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ صفاتی اسمارِ عظیمہ پیغمبروں کی مروجہ زبانوں میں وضع ہوئے تھے اور وہ اسمارِ الٰہیہ جو قرآنِ کریم میں وارد ہوئے ہیں وہ ان کے ہم معنی تو کہے جا سکتے ہیں لیکن ہو بہو ہرگز نہیں کہے جا سکتے۔

حقیقتِ معرفتِ صفات پر شیخِ کامل نے اس طرح ارشاد فرمایا: "فکرِ عارف تا بہ صفاتِ باری تعالیٰ می رسد" صفات مقامِ تعارف ہے جو لازمِ ذات ہے اور قدیم ہے ان کے انوار و تجلیّات تمام امکان کے ساتھ تعلّق رکھتے ہیں بلکہ نظامِ امکانی ان سے جاری ہے ولی، اللہ تعالیٰ کے انہی صفاتی ناموں کے انوار سے سیراب ہوتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ ولیٔ کامل جب مقامِ غوثیت میں داخل ہوتا ہے تو وہ ان ننانوے صفاتی ناموں کے انوار سے سیراب ہو کر اللہ تعالیٰ کے سوویں نام تک آ جاتا ہے اسے ہی اسمِ اعظم کہتے ہیں یہ زبان سے ادا نہیں ہوتا بلکہ ذات سے ادا ہوتا ہے یہ اس قدر بھاری نام ہے کہ غوث جو نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتا ہے وہ بھی اسے دن میں دو مرتبہ سے زائد ادا نہیں اللہ تعالیٰ کے اسمارِ صفاتی مثلاً عزیز، غفّار، جبّار، کریم، یہ سب

مقامِ معرفت ہے۔ اور جب ان اسماء صفاتی کے ساتھ اس طرح نسبت پیدا ہو مثلاً عزیز الحق، عزیز الرحمٰن وغیرہ تو اسے مقامِ دعوت کہتے ہیں۔

حقیقتِ معرفتِ ذات بالواسطہ جلّ شانہٗ

یہ غرض و مقصود بندہ ہے تاکہ اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ کی رضا حاصل ہو اور بندہ خود کو واجب کے سامنے ناچیز جانے اور اس طریق کے تمام اصول و قواعد قرآن و سُنّت سے مستنبط ہوتے ہیں۔

حقیقتِ معرفتِ ذات بلاواسطہ

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا بِكَرَمِكَ يَا كَرِيْم۔

اللہ تعالیٰ کی ذات بے چون اور بے گون ہے، وہ حق ہے اس کی ابتداء ہے نہ انتہا۔ اس کی ذات مبارکہ ما وراء الورا ہے یعنی وہ ہرگز مخلوق جیسا نہیں اس کی صفت یا فعل کو مخلوق کی صفت یا فعل جیسا نہیں گردانا جا سکتا۔[1] یہ معرفت خاتمِ مقامات ہے باقی درج ذیل چار سیر ہیں۔

(۱) ناسوت (۲) ملکوت (۳) جبروت (۴) لاہوت

ناسوت اس کے معنی ہیں اجساد۔ یہ تحت الثریٰ سے اوّل آسمان تک ہے۔ ناسوت ذاکرہ ہے۔

ملکوت اس کا دائرہ آسمان سے سدرۃ المنتہیٰ تک ہے۔ یہ عالمِ ارواح و عالمِ مثال ہے۔ ملکوت ذکرِ اسمِ ذات ہے۔

جبروت سدرۃ المنتہیٰ سے لامکان تک اس کی حدود ہیں۔ یہ مقامِ اسماءِ صفت ہے جبروت فکرِ صفات ہے۔

---

[1] جو شخص اپنے خالق کو پہچاننے کے درپے ہو اگر اسکی معرفت کسی ایسے موجود پر ختم ہوگئی جس تک اسکا ذہن پہنچ سکتا ہے تو یہ شخص مشبہ ہے اور اگر خالص عدم تک پہنچ کر مطمئن ہوگیا ہو تو یہ معطل ہے (حضرت [illegible])

لاہوت جملہ منازل اسمِ ذات میں ختم ہوتے ہیں اس حرف ہمزہ اسمِ ذات سے ناسوت ختم ہوتا ہے۔ لام سے ملکوت ختم ہوتا ہے مدِ لام سے جبروت ختم ہوتا ہے۔ عروجِ فکر اور حرفِ ھاؔ سے لاہوت یعنی رسائی و لقائے ذاتِ اقدس ہوتا ہے ایک لفظ اللہ میں سب ہی کچھ ہے اگر یکتائی و حضوری ہو۔ خود ذات باری تعالیٰ نے کہیں اسے منازل کہا ہے اور کہیں اسے سیر کا نام دیا ہے۔ یہ مقامِ حضورِ ذاتِ اقدس ہے ——

مقامِ توبہ تصوف کا پہلا مقام ہی مقامِ توبہ ہے۔ اس مقام پر ناجائز کو چھوڑنے اور جائز پر قائم رہنے کا عہد کیا جاتا ہے۔ یعنی امتثالِ اوامر، اجتنابِ نواہی ترکِ لایعنی اور حُسنِ اعمال جس کا نام ہے "احسان" اس کا دار و مدار حضوری پر ہے اور اس

اور مُشبہ کی تشریح میں مولانا ظفر احمد عثمانی لکھتے ہیں "مُشبہ وہ فرقہ ہے جو اللہ تعالیٰ کیلئے مخلوق جیسی صفات ثابت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھی ہاتھ پیر ہیں۔ ہماری ہی طرح سنتا دیکھتا اور جانتا ہے اور معطل وہ فرقہ ہے جو اللہ تعالیٰ کیلئے نہ مخلوق جیسی صفات ثابت کرتا ہے نہ ان صفات کو ثابت کرتا ہے جو خالق کے لائق ہیں۔ بلکہ جن صفاتِ کمال کا ذکر قرآنِ شریف میں آیا ہے۔ ان کی تفسیر بھی نفی سے کرتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قادر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عاجز نہیں۔ علیم کا مطلب یہ ہے کہ جاہل نہیں۔ یہ مطلب نہیں مانتا کہ اللہ تعالیٰ میں علم اور قدرت کی صفت موجود ہے۔ موحد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو موجود مانتا اور اس کیلئے صفات اور مطلب کمال کو ثابت کرتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی حقیقت و کنہ کو نہ بیان کر سکتا ہوں نہ سمجھ سکتا ہوں صرف دلائل عقلیہ و نقلیہ سے صانعِ عالم کے وجود اور وحدت اور تمام صفات کمال کا قائل ہوں اور دنیا بھر کو قائل کر سکتا ہوں مگر ذات و صفات کے تعلق کی حقیقت نہیں بتلا سکتا کیونکہ انسان خود اپنی حقیقت اور اپنی ہی صفات و ذات کے تعلق کو نہیں بتلا سکتا۔ (بنیان المشید ص۳۲)

حضرت سید احمد رفاعیؒ "البرہان المؤید" میں لکھتے ہیں " بزرگو! اللہ تعالیٰ کو محدثات کے عیوب اور مخلوقات جیسی صفات سے منزہ سمجھو"۔ محدث وہ ہے جو پہلے نہ تھا پھر موجود ہوا۔ قدیم وہ ہے جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے۔ اللہ اور اس کے کلام کے علاوہ سب محدث ہیں۔

کی قبولیت اخلاص پر ہے جو حصولِ مدارجِ ہٰذا کا سبب ہے۔

مقامِ انابت تصوف کا یہ دوسرا مقام ہے۔ اقرار کرنا تقصیر پر اور بیان کرنا احسان کا اللہ سے ہر حال میں راضی رہنا اور اپنے اندر اللہ کے اس طرح اخلاق پیدا کرنا کہ خلیفۃ اللہ کہلانے کا مستحق ہو اور اس صورت میں عوامل کا اجراء کرے۔

مقامِ توکل تصوف کا یہ تیسرا مقام ہے۔ یعنی ذاتِ باری تعالیٰ پر ہر چیز میں بھروسہ رکھنا توکل کا معنی یہ ہے کہ ظنی چیزوں (مشکوک چیزوں) کو چھوڑے اور تشریعی چیزوں کا استعمال کرے۔

مقامِ تسلیم مقامِ تسلیم کا مطلب ہے کہ اپنے آپ کو کلیتہً اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے اور صرف اسی سے اپنی امیدیں وابستہ رکھے۔

تفویض جس نے اپنے احوال، اعمال اور کل کاروبارِ حیات سپردِ خدا کر دیا ہو۔ اگر اس کا نتیجہ اس کی طبیعت کے مطابق نہ نکلے اور وہ کوئی گلہ، کوئی شکوہ اور کوئی شکایت نہ زبان پر لائے اور نہ ذہن میں تو وہ گویا مقامِ تفویض میں ہے

حکایت دو درویش دریا کے کنارے جا رہے تھے کہ راستے میں ان کی ملاقات ایک اور درویش سے ہوئی۔ انہوں نے اس خدا رسیدہ بزرگ سے سوال کیا کہ خدا تک پہنچنے کا کونسا راستہ ہے؟ اس درویش نے جواب میں کہا کہ خدا تک پہنچنے کے دو راستے ہیں، ایک وہ جس پر تم جا رہے ہو یہ دلیل اور سوال و جواب کا راستہ ہے اور دوسرا وہ راستہ ہے جس پر اہلِ یقین گامزن ہوتے ہیں، یہ "دلیل"، حجت اور "ثبوت" جیسے جھنجھٹوں سے مبرّا ہوتے ہیں۔

مقام اور حال حال وقت سے تعلق رکھتا ہے۔ وقت موہوبی چیز ہے جو وقت اور عمل کے درمیان ہے۔ وقت سے مراد وہ موہوبی وقت ہے جب آدمی اللہ تعالیٰ کیطرف خاص طریق پر متوجہ ہو جائے اور جبتک اس میں رہے وقت ہے۔ حال اور

وقت میں ایک مناسبت ہے۔ تصوّف میں وقت، حال کو کہتے ہیں حال وہ ہے جو بغیر کسب سے ہوتا ہے اور فقط اللہ کی مہربانی سے انسان پر وارد ہوتا ہے، جو نہ کسی کے دُور کرنے سے دُور ہوتا ہے اور نہ کسی کے لانے سے آسکتا ہے۔ تصوّف میں کسی بھی چیز کو عمل میں لانے سے پہلے اچھی طرح تحقیق کر لینی چاہیئے۔ اگر کسی چیز کی بُنیاد میں ادنیٰ سے ادنیٰ گناہ بھی موجود ہے بلکہ اس کا شائبہ بھی ہے تو وہ چیز طالب حق کے لئے کسی طور نافع نہ ہو گی۔ اگرچہ بظاہر وہ مباح ہی کیوں نہ دکھائی دیتی ہو۔ اس سے دُوری ہی بہتر ہے۔

مقامِ رضا

مقامِ رضا یہ ہے کہ آدمی پر جو کیفیت خیر یا شر کی وارد ہوتی ہے وہ باذن اللہ جانے، وہ جو عبادت و ریاضت کرتا ہے، صرف اپنے آقا کو راضی کرنے کرنے کیلئے کرے تاکہ اللہ اپنے بندے سے راضی ہو جائے۔

جزا، بدلہ، صلہ، جنّت اور دوزخ وغیرہ پر نظر نہ ہو بلکہ اعمالِ صالحہ سے اُمید رکھے کہ الحمدللہ اس ذاتِ اقدس نے اپنی رضا والے عمل کی توفیق بخشی۔ رضا بھی ایک حال ہے موہوبی اللہ ربّ العزّت جس کو چاہتا ہے اس حال اور اس قوّت و استعداد سے نوازتا ہے کہ وہ راضی برضا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ جس کو یہ عزت نہ بخشنا چاہیں وہ اس رضا کی عظمت سے محروم رہتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ توفیقِ رضا من اللہ ہے اور یہ کوئی کسبی نہیں یا عشق اللہ دمزاولت سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس کا ایک رُخ کسبی بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ کسبی تخیّلی ہو گا۔ کیونکہ طبیعت کی پریشانی غیر اختیاری ہے اور وہی رضا انتہائے سلوک ہے۔ رضائے ذات، استحضارِ ذات، معائنہ ذات، مکاشفۂ ذات اور مکاشفۂ اسرارِ ذات، یہ سب اسرارِ سلوک ہیں، مقامِ دعوت سے ہیں اور ذات مقامِ کُل ہے۔

پس انسان کو چاہیئے کہ ہر وقت ہر کام میں متوجہ اِلیٰ اللہ رہے۔ ہر کام کا ہونا، نہ ہونا اللہ ہی کی طرف سے خیال کرے۔ اور کسی بھی حالت میں بندہ کی طرف منسوب نہ کرے۔

قُرب

"قُرب چہ بود؟ ارتفاعِ غفلت است" قُرب کیا ہے؟ ارتفاعِ غفلت ہے۔ یعنی غفلت

کا دُور ہونا اور غفلت سے نکلنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا خواہ کسی صورت سے ہو۔

بُعد

"بُعد چہ بود؟ اتباعِ غفلت است"۔ بُعد (دُوری) کیا ہے، غفلت کی پیروی ہے یعنی غفلت کے تابع ہونا اور اللہ سبحانہٗ سے غافل رہنا، اور اس عظیم ہستی کی طرف متوجہ نہ ہونا وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات قُرب اور بُعد سے پاک ہے۔ یہ قریب اور بعید کی صفات انسان سے مختص ہیں۔ انسان بسببِ نیکی قریب ہے اور بسببِ بدی دُور ہے۔ ورنہ وجوبِ قُربِ اللہ تعالیٰ کا ہر ممکن کے ساتھ ہے۔ قدرۃً، بصراً، سمعاً، ربوبیتاً، رحمانیۃً، ملکۃً وغیرہ وغیرہ۔

حجاب

حجاب کیا چیز ہے؟ غفلت یا اللہ تعالیٰ سے لاپرواہی، غائب ہونا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ کرنا، اور شیطان کے تابع رہنا، نفس کو اپنے اُوپر سوار کر لینا۔ — دُنیا کی ہر چیز خواہ چھوٹی ہو خواہ بڑی، خواہ قریب ہو خواہ بعید، خواہ مُضر ہو خواہ مفید، سب حجاب ہے۔ اگر اس کے تعلّق کو ذاتِ باری کے علاوہ کسی اور سے منسوب کیا گیا۔ مزید یہ کہ اگر انکو عبرت نہیں سمجھا گیا تو حجاب ہے۔ ان چیزوں کو دیکھنے سے اگر طالبِ حق عبرت پکڑ گیا تو اس کا نام ہے تجلّی عبرت۔ اس تجلّی سے طالبِ حق تجلّی تکوین تک پہنچتا ہے۔ تکوین کے معنی فعلِ باری تعالیٰ یعنی اللہ تعالیٰ کا کُلّی طور پر اپنی مرضی سے کام کرنا یا نہ کرنا اور اس تکوین کا نام ہے افعال۔ اور افعال کا تعلّق قدرت کے ساتھ ہے اور قدرت کا تعلّق جبروت سے ہے اسماءِ باری تعالیٰ کے ساتھ جیسے رحیم، غفّار، ستّار وغیرہ اور یہ ذاتِ باری تعالیٰ کا مظہر ہے فنا اور بقا۔ نفع اور ضرر تو لاریب مِنَ اللہ ہے۔ مؤمن کو یقین رکھنا چاہیئے کہ معمولی سے معمولی حرکت بھی من جانب اللہ ہوتی ہے۔ کوئی چیز امکانی حکمِ الٰہی کے بغیر حرکت نہیں کر سکتی۔ لَا تَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰه۔ تو مؤمن کو چاہیئے کہ اس نظامِ کائنات میں تجلیاتِ توحید حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اس تجلّی سے متوجہ اِلی اللہ رہے۔

اصطلاحِ شریعت میں ایک ستر ہے اور ایک حجاب ہے۔ ستر مردوں اور عورتوں

دونوں کے لئے لازم ہے فرق صرف اتنا ہے کہ مرد کا ستر زانو سے لے کر ناف تک ہے اس کا کھولنا جائز نہیں اور حجاب یعنی پردہ مردوں کے لئے نہیں ہے (تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے اس دور میں مسلمانوں میں کچھ ایسے گمراہ قبائل بھی موجود ہیں جن میں مرد چہرے کا ستر کرتے ہیں اور عورتیں بے حجاب ہیں) عورت کے لئے ستر اور حجاب دونوں لازم ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ "وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ"

ترجمہ:۔ (تم اپنے گھروں ہی میں رہو اور دکھاوا یا نمائش نہ کرتی پھرو جیساکہ اس سے پہلے زمانہ جاہلیت میں ہوتا رہا)

مستورات کے لئے حجاب اور ستر دونوں لازم ہیں۔ حجاب سے مراد گھر کی چہار دیواری میں رہنا اور اشد ضرورت کے تحت باہر جانا تو برقع میں جانا وغیرہ، عورت کو ستر کھولنا جائز ہے اور نہ نمائش لباس۔ اور اگر کوئی محرم ہے تو اس کے سامنے ہاتھ پاؤں، منہ اور سر کھولنا جائز ہے اور نامحرم کے سامنے کوئی بھی عضو کھولنا جائز نہیں۔ عورت کے لئے گھر سے باہر نکلتے ہوئے خوشبو لگانا قطعاً ناجائز ہے۔ عورت جب ضرورتاً یا مجبوراً گھر سے باہر جائے تو انتہائی سادہ اور غیر دیدہ زیب لباس میں جائے۔ عورت کا تمام بدن عورت ہے۔ خواہ کپڑوں میں ہو، خواہ کپڑوں کے بغیر۔ صحابہ کرامؓ اور محتاط مسلمانوں کے یہاں آواز کا بھی پردہ ہے۔ ہاں اگر انتہائی ضرورت یا مجبوری ہو، عورت نامحرم سے بات کر سکتی ہے لیکن کوشش کر کے ایسی آواز میں کلام کرے کہ جاذبیت صوت مفقود ہو - ایک اور چیز جس کا زہر بڑے بڑے نام نہاد جید عالموں دیندار گھرانوں میں سرایت کئے ہوئے ہے" وہ ہے تایا زاد، چچا زاد، ماموں زاد، پھوپھی زاد، خالہ زاد بھائیوں اور شوہر کے بالغ بھتیجوں اور بالغ بھانجوں کو اپنے قریبی سمجھ کر محرموں کی فہرست میں بزعم خود شامل کر لینا اور ان کے سامنے اسی طرح آنا جانا، اٹھنا بیٹھنا، گفتگو کرنا گویا کہ وہ ان کے عین محرم ہیں۔ یہ از روئے قرآن و حدیث صریحاً "گناہ کبیرہ ہے اور ایسا کرنے سے عورت اور مرد زنا کی مختلف صورتوں کے گناہوں اور عذابوں میں مبتلا ہوتے ہیں

ایسا کرنیوالوں میں کچھ لوگ تو اپنے گناہ کا اعتراف کرتے ہیں گویا وہ گناہ کو گناہ تسلیم کرتے ہیں لہذا صرف گنہگار ہیں لیکن افسوس صد افسوس اس گناہ میں ملوّث اکثر حضرات اسے گناہ ہی نہیں سمجھتے بلکہ معاشرے کے عام چلن کے تحت اسے قطعی جائز سمجھتے ہیں اور پردہ کے قرآنی تصوّر کو عملاً دقیانوسی اور نا قابلِ عمل تصوّر خیال کرتے ہیں - اس نوع کے لوگوں کو کیا کہا جائے ؟ مفتیانِ اسلام سے پوچھنا چاہیئے۔

ستر اور حجاب کا مذکورہ بالا تصوّر تو ہے شرعی مگر تصوّف یا طریقت کا حجاب یہ ہے کہ دل میں اللہ کے سوا کسی اور کو نہ آنے دے[1] لہذا طالبِ حق کو چاہیئے کہ اللہ کے سوا ہر چیز کے خیال کو ذکر فکر اور مشاہدہ سے دُور کرنے کی مسلسل کوشش میں لگا رہے۔ اور اگر طالبِ حق اپنے دل میں ماسوا کا خیال قصداً لا وے تو غفلت ہے - اگر سہواً ہے تو حجاب ہے - اس کا علاج اللہ کے ذکر کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ

جب تم کو بھول جاوے (اللہ) تو یاد کرو اللہ کو

یاد رہے کہ اللہ کو قصداً بھُول جانا کفر ہے۔

ستر اور حجاب مخلوق سے ہے نہ کہ اللہ سے کیونکہ عالِم اور دانا ہے۔ پس ستر اور حجاب دونوں قانونِ شریعت کی وجہ سے ہیں۔ ہاں جس نے اپنے نفس سے ستر کیا اس نے اپنے اللہ سے ستر کیا۔ میاں بیوی کے درمیان کوئی ستر یا حجاب نہیں۔ مگر بغیر ضرورت کے خاوند کو بھی ستر کے حصّوں کو دیکھنا جائز نہیں کیونکہ یہ قانون شریعت کے منافی ہے اور ایک مؤمن کے لیئے یہ اللہ سے ستر توڑنے کے مترادف ہے۔ مؤاخذہ اور بخشش، ثواب

---

[1] فَلَوْ خَطَرَتْ لِىْ فِىْ سِوَاكَ اِرَادَةٌ
عَلٰى خَاطِرِىْ سَهْوًا قَضَيْتُ بِرِدَّتِىْ

اُے خدا تیرے سوا میرے دل میں کسی اور کا خیال اگر بھُول کر بھی گزر جائے تو میں اپنے مُرتد ہونیکا اعلان کردوں۔

اور عذاب، راحت اور زحمت، تعریف اور تنقیص، توحید اور الحاد سب شریعت سے متعلق ہے، طبیعت اور فعل کا اس میں کوئی دخل نہیں، ورنہ یہ خلاف طریقت اور خلاف شریعت ہوگا اور ضعفِ ایمان کا نشان ہے، اگر عملاً ہو جائے اور اگر اعتقاداً ہے تو زوالِ ایمان کا نتیجہ ہے۔

ایمان ـــــ ایمان ایک نور ہے صفتِ ہدایت کا جو ظاہر میں کلمۂ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" پڑھ لینے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ باطن میں یہ نور تصدیق، شوق اور محبّت سے پیدا ہوتا ہے یہی وہ نور ہے جس کے ذریعے سے عمل صالح بنتا ہے۔ وہ اقرار اور تصدیقِ ایمان نہیں بلکہ وہ تو محض ذکرِ ارکان ہے۔ ایمان اور اس کے عملی پہلو ہی کو اسلام کہتے ہیں جس کا دارومدار پانچ ارکان پر ہے، ــــ علماً اور عملاً اور یہی "نقطۂ نوری" قلب کے اندر مقام "سویدا" ہے۔ سویدا اصطلاحاً اس سیاہ خون کو کہتے ہیں جو قلب کے دو بطنوں میں ہے یعنی جوف یسرا (بایاں خانۂ قلب) اور جوف یمنا (دایاں خانۂ قلب) ایمان بھی اسی سے تعلّق رکھتا ہے اور خون بھی اسی سے تعلّق رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جنّوں اور انسانوں کو پیدا ہی عبادت کے لئے کیا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے" وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ "۔ اور عبادت کا اَدب و دستور اور ان کی تربیّت و اُتکل اور ان کے طرز کے متعلّق قرآن پاک میں کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی کا نام قانونِ سماوی ہے اور حدیثِ نبویؐ کو شرح قرآن سے زیادہ موزوں اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح محدّثین اور فقہا کے اجتہادات اور اسی موضوع کی دیگر کتابیں شروحِ حدیث کے زمرے میں آئیں گی، اور ان کتابوں سے تربیّت حاصل کرنا اور جو دستور ان سے حاصل ہوتا ہے، اس کے مطابق عبادت کرنا، بس یہی فلاح کا راستہ ہے۔ اگر قرآن، حدیث اور فقہ کے خلاف کوئی کام ہوا تو وہ ناجائز ہے جو گناہ بھی ہے اور خسارہ بھی۔

یہاں ایک بات ہرگز نہیں بھولنی چاہیئے اور وہ یہ کہ چاروں آئمہ کے یہاں سے کوئی

بھی مسئلہ اختیار کرنا قطعی جائز ہے۔

(ان چاروں ائمہؒ کے اختلافی مسائل کا تقابلی مطالعہ "مواھب رحمانی" میں امام سید عبدالوہاب شعرانی شافعیؒ نے خوب کیا ہے۔)

شریعت اور طریقت

آیئے دیکھیں خود قرآن کریم شریعت کے متعلّق کیا کہتا ہے؟ ــــ " پھر ہم نے آپؐ کو دین کے ایک خاص طریق یعنی شریعت پر کر دیا سو آپؐ اسی طریق پر چلتے جایئے اور ان جاہلوں کی خواہش پر نہ چلیئے۔ یہ شریعت عام لوگوں کے لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ اور یقین کرنے والوں کے لئے رحمت ہے۔"

(سورۃ الجاثیہ پ ۲۵)

جن لوگوں نے شریعت کو طریقت سے جُدا کیا ہے انہوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔

انسان کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔

بس یوں سمجھیئے کہ انسان کا ظاہر شریعت ہے اور باطن طریقت۔ انسان کے دل کے اندر ایک نور ہے جس کی حفاظت کے لئے جسم ہے، بالکل قندیل کی مانند۔ یا سورج کو روشنی سے جو تعلق ہے وہی شریعت کو طریقت سے ہے۔ ان دونوں میں معاونت ہے نہ کہ مغائرت۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو طریقت کا سرے سے بطلان کرتے ہیں؛ انکی گمراہی بھی مسلّم ہے کیونکہ احسان یا تزکیہ یا تصوف یا طریقت قرآن اور حدیث سے قطعی ثابت ہے۔

یہ ایک بڑا عطیۂ الٰہی ہے جس کا کسب سے کوئی تعلّق نہیں، یہ خالص وہبی چیز ہے بے ظرف اور محروم اس کی بُو کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔

ذکر اللہ بہ خشیتِ الٰہی یا خوفِ خدا وہی عمل کرتا ہے جو موافق ہوا کسی بادبانی کشتی کے لئے کرتی ہے۔ صاحبِ بصیرت اور عقلِ سلیم کے مالک ہمیشہ رواج سے متنفر

رہے ہیں۔ لہٰذا وہ لوگ جو ذکر اللہ کو روا جا کرنے لگتے ہیں، اللہ کی نظر میں وہ مردود ہیں اور دُنیا میں ذلّت ان کا مقدر ہے (اس کا فیصلہ صاحب بصیرت اور عقلِ سلیم کے حامل حضرات کے ہاتھ ہے نہ کہ جہلا اور گمراہوں کے ہاتھ میں) اور ایک ذکر اللہ ہوتا ہے خوفِ الٰہی سے، یہی وجہ ہے کہ اس نوع کے ذاکرین کی لوگوں پر دہل ہوتی ہے۔ ذاکرین کی ایک جماعت ایسی ہے جو ذکر اللہ شوق اور محبّت سے کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ ان سے محبت کرتے ہیں۔

اصولِ دین

دین کا سیدھا سادھا اصول یہ ہے کہ توحیدِ خداوندی اور رسالتِ محمّدی پر ایمان کے ساتھ ساتھ منیبین اور صالحین کی اتباع کو بھی اوڑھنا بچھونا بنایا جائے اور زندگی کے ہر رُخ کا تعین رسولِ مقبول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ سے کیا جائے اور اگر کہیں بھی شبہ محسوس ہو تو فوراً قرآن و سنّت کے سانچے میں عمل کو بٹھایا جائے، اگر کسی عمل کو ان سانچوں میں پورا نہ پائے تو اس سے بچے بلکہ اس سے زیادہ سے زیادہ دُور بھاگے اس لئے کہ یقیناً اس صورت میں اس کے نفس کا عمل دخل ہوتا ہے اور عابد کے لئے غرور و تکبّر کے راستے ہموار ہو جاتے ہیں، عظمتِ خداوندی کا جلال اس پر سے اُٹھ جاتا ہے اور حفاظت کے شرعی ہتھیار اس سے چھن جاتے ہیں بس اب وہ مسلح شیطان کے سامنے نہتا رہ جاتا ہے اور ہلاکت اس کا مقدّر بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی رحمتِ خاص سے ہر ہلاکت سے محفوظ رکھے !! عبادت کیا ہے؟ ذاتِ کبریا کا اثبات اور قولاً و فعلاً عظمتِ خداوندی کا اقرار کرنا اور بندگی کر کے اس کا ثبوت فراہم کرنا پھر نماز پر غور کرو یہ قیام، رکوع، سجدہ اور قعدہ کیا ہے؟ فقط عاجزی — رضائے الٰہی کو حاصل کرنے کا سب سے بڑا اور سہل طریق یہ ہے کہ کلمہ پڑھنے والا کلمہ پڑھتے وقت صرف خدا کی خوشنودی اور اطاعت کو پیشِ نظر رکھے۔

اسی طرح نماز پڑھنے والا، روزہ رکھنے والا، زکوٰۃ دینے والا، حج کرنے والا اور صدقہ وغیرہ

کرنے والا اپنے اعمال پر نازاں نہ ہو بلکہ یہ سب کچھ رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر کرے اس صورت میں اس کا عمل عبادت ہے ورنہ تو بندگیٔ نفس ہے ــــ اور عمل وہی نافع ہے جو صالح ہو اور عمل صالح صلہ اور نمود و نمائش سے بہر طور پاک ہوتا ہے۔ اور خالصتاً بندگی اور رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر ہوتا ہے۔

طرزِ عبادت اور طرزِ ذکر

عبادت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک عبادت لفظی اور دوسری عبادت معنوی ہے۔

لفظی عبادت تو الفاظ کا صرف ادا کرنا ہے۔ معنوی عبادت ذات کا استحضار بھی ہے الفاظ کے معنوں کا بھی۔ اگر آدمی ذکر تو کرتا ہے اللہ اللہ کا لیکن اللہ کی یاد سے غافل ہے جس کی وجہ سے اس اسمِ ذات کے اثرات مرتب نہیں ہوتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ ذکر صرف الفاظ کے ادا کرنے تک محدود ہے۔ ذکر کرتے وقت اللہ کو یاد رکھنا اور اسے رگ و پے میں بسانا، یہ حضور ہے اور یہی معنوی عبادت ہے۔

ذکر کے کچھ اعضائی انداز بھی ہیں اور ان کا مدار صرف نیک نیتی پر مبنی ہے۔ جیسے پاؤں کا ذکر نیک کام کی طرف چلنا اور برے کام کی طرف سے رکنا۔ اور ہاتھ کا ذکر یہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو صرف نیکی کے کاموں میں استعمال کرے۔ اور آنکھ کا ذکر یہ ہے کہ وہ محرم اور جائز کو دیکھے (اور ناجائز اور نامحرم کو نہ دیکھے)، اور کان کا ذکر نیک بات سننا اور بری بات کا نہ سننا جیسے غیبت، بہتان اور لغویات وغیرہ۔ دماغ کا ذکر جائز اور مثبت سوچ اور ناجائز اور منفی کا نہ سوچنا اور دل کا ذکر ہر وقت توجہ الی اللہ اور عابد کا ذہن، حضور کے سوا کچھ نہیں۔ اسی طرح مخفی اعضا کا ذکر ہے۔ اس طور کہ سُنّتِ محمدی کے مطابق اسے صرف حلال مقام پہ کام میں لائے اور حرام مقام سے ہر حال میں بچے۔ زبان کا ذکر تسبیحات، تکبیدات، تہلیلات، تحمیدات اور استغفار و تشکر ہے۔ اور ناک کا ذکر طیبات کو سونگھنا اور غیر طیب کا نہ سونگھنا جیسے بدبو، قوت و طاقت کا ذکر یہ ہے کہ اپنے آپ کو، اپنے اہلِ خانہ کو اور اپنے زیرِ اثر حضرات کو ناجائز سے روکے اور انہیں عبادت

میں مشغول کرنے کی ترغیب دے اور غفلت سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

ناجائز سے رکنے اور روکنے کی یہ صورتیں ہو سکتی ہیں۔ زبان سے۔ تحریر سے۔ طاقت سے اور اگر بہت ہی کم ایمان والا ہے تو اسے چاہیئے کہ اسے دل سے برا جانے تو ہی ایمان طاقت سے روکنا مسلمان کا مسلمان پر حق ہے۔ کہ وہ اپنے اس بھائی کو جائز کام بتا دے جسے اس کا علم نہیں اور اسے حتی المقدور ناجائز کام سے ہٹانے کی کوشش کرے اگر وہ بطریق احسن مان جاتا ہے تو سبحان اللہ اور اگر نہیں مانتا تو اس کا معاملہ خدا کے سپرد کر دے۔ ایسا کرنے میں حکمت یہ ہے کہ قیامت کے روز جب نہ ماننے والے کی پکڑ ہو گی تو بتانے والا بچ جائے گا۔ اور بتانے کا اجر بھی پائے گا۔ لیکن وہ شخص جس نے اپنے مسلمان بھائی کو ناجائز کام کرتے دیکھا اور باوجود قدرت کے اس کو اس سے نہ روکا تو قیامت کے روز دونوں سزاوار ہوں گے۔ اللہ تعالے ہمیں اپنی رحمت سے دونوں جہانوں کی سزا سے بچائے!!؟

موت

انسان دو چیزوں کے درمیان ہے، ایک موت اور دوسری حیات۔ حیات ظنی ہے بے اعتبار ہے اور بے ثبات ہے۔ مگر ظنی ہے دار العمل ہے اور اس پر آخرت کا مدار ہے۔ اور موت؟ یہ حیات کے عمل کو ساقط کر دیتی ہے۔ ہاں اگر مردہ صدقات جاریہ کا بندوبست کر گیا ہے تو اس کی نیکیاں مسلسل بڑھتی رہیں گی اور خیر کا عمل قیامت تک جاری و ساری رہے گا۔ موت یقینی بھی ہے اور ضروری بھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا موت میں جسم کے ساتھ روح بھی مر جاتی ہے؟ روح نہیں مرتی۔ دراصل موت روح ارکانی سے روح امری کے انقطاع کا نام ہے۔ اور روح ارکانی کا تعلق جسد مرکب کے ساتھ ہے۔ یعنی اس جسد کے ساتھ جو ارکان اربعہ سے تیار ہوتا ہے۔ یعنی، مٹی، پانی، آگ، ہوا۔

روح امری کا تعلق روح طبعی کے ساتھ ہے۔ گویا روح طبعی سے انقطاع روح

امرِ ہی موت ہے۔ روح کا وجود علمِ الہٰی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ہم لوگوں کے احاطۂ علم سے باہر ہے۔

حروف

ہر حرف ایک طلسم ہے کلمہ کے لئے یعنی کلمہ کا وجود حرف ہی سے بنتا ہے۔ اور حرف کا وجود ہوا سے بنتا ہے۔ جس کا تصرف زبان پر ہے، یہ دانت اور ہونٹوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور کلمہ بھی طلسم ہے معنی کا اور جو معنی ہے وہ مقصود اور مطلوب پر دلالت کرتا ہے۔ اور یہ جو روح ہے مرادیہ ہے مقصود کا، معنی کا، مطلب کا۔ حرف کے ذریعے یاد، یہ لفظی ذکر ہے۔ ہر حرف کا علیحدہ ایک نور ہے اور معنی تو خود نور ہے ذاکر کو چاہیئے کہ حرف کی تکرار کرنے وقت معنی پر دھیان رکھے یہ مقامِ حضور ہے، اور مقامِ حضور میں لازم ہے کہ اس طریقے سے عبادت کرے اللہ سبحانہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر ایسا کرنے پر قادر نہیں تو کم از کم اتنا کرے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ حرف دلالت کرتا ہے مقصود کی طرف۔ اس کے تجلیات اور انوار بہت ہیں۔ یاد رہے جس علم کی تکرار زیادہ ہوگی۔ اس کے انوار بھی اسی نسبت سے ہوں گے۔ قرآن کریم کے جملہ الفاظ انوار ہیں۔ اور عبادت ہے اور معنوی شان بذاتِ خود عبادت ہے۔ یہ قرآن کریم صفتِ باری تعالیٰ ازلی اور ابدی ہے۔ تو قرآن کے دو پہلو ہوئے ایک کا تعلق الفاظ کے ساتھ ہے، یہ تو مخلوق ہے۔ ایک جو معنی اور ذات کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، یہ قدیم ہے، ازلی ہے، ابدی ہے، غیر مخلوق ہے۔ اللہ کا کلام مخلوق نہیں ہے جو اس کی طرف منسوب ہے۔ قرآن کے معنی مجموعہ احکامِ الہٰی۔ قرآن کے لفظی معنی اونٹوں کے پینے کا حوض اور اصطلاح میں مجموعۂ احکامِ الہٰی اور اوامر و نواہی کا ایک خلاصہ ہے اور ایک تمیز ہے اولیٰ دعوتِ الہٰی ہے بندوں کو اپنے رب کی طرف، اس قرآن کے ذریعے سے۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ سورۃ بقرہ کے شروع ہی میں فرماتا ہے۔ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" جو اللہ سے ڈرتا ہے۔ اسی کو رستہ بتایا جاتا ہے۔ یہ

بات یاد رہے کہ قرآن و سنت کے ذریعے جو اسلام پیش کیا گیا ہے۔ اسلام اتنا ہی ہے۔ نہ اس سے زیادہ اور نہ ہی اس سے کم۔ اور جس نے قرآن و سنت کی حدود سے تجاوز کیا۔ اس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔ اور جو قرآن و سنت کی پگڈنڈیوں پہ سیدھا سیدھا چلتا رہا۔ بس وہی دینِ محمدی اور دینِ خالص کا سالک ہے۔ دنیا میں جتنا بھی دین ہے، وہ قرآن و سنت کی بدولت ہے۔ افسوس کہ اب تک جتنی کتابیں علوم القرآن کے نام سے لکھی گئی ہیں۔ وہ سب ناقص، ادھوری اور بے اثر ہیں۔ اس میں تمام علوم کو تلاش کیا جاتا رہا ہے۔ جن کا تعلق خالصتاً ہماری مادی دنیا سے ہے۔ (اور ایک مدت دراز سے جس کی عنان اہلِ مغرب کے ہاتھ میں ہے۔) حالانکہ قرآن کریم میں وہ علوم موجود ہیں۔ جہاں جدید علمائے عالم معذور اور اپاہج ہیں۔ قرآن کریم میں ہر علم موجود ہے۔ خواہ اس کا تعلق عالم علوی سے ہے، خواہ عالم سفلی سے۔ قرآن معارفِ خداوندی کا خزینہ ہے اور دعوت الی اللہ ہے۔ جو عالمِ قرآن ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عاملِ قرآن بھی ہے، ایسے ہی لوگوں کے لئے آیا ہے کہ انہیں زمین پہ نہیں چلنے دینا چاہیئے۔ ان کے لئے دلوں کو فرشِ راہ کر دینا چاہیئے۔ اور جو عالمِ قرآن ہے، اور اس کے باوجود اس کا عمل قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ وہ علمائے سُو سے ہے۔ اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اور جو مخالفِ قرآن ہے، وہ کافر ہے۔ اور اللہ کا دشمن ہے، اس کے لئے دردناک عذاب کی وعید ہے۔

ایمان

ایمان کا ظاہر یہ ہے کہ بندہ ظاہری طور پر اور ظاہری الفاظ میں اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرے اور ایمان کا باطنی پہلو یہ ہے کہ دل سے تصدیق کر کے عمل کرے۔

ایک شریعت کا ایمان ہے اور ایک طریقت کا ایمان ہے۔ شریعت کا ایمان تمام احکامِ شرعی کو علماً ماننا اور اس کا اکتساب کرنا اور قصداً ان تمام اصولوں پر چلنا جو قرآن و سنت سے مستفاد ہوتے ہیں، اور دل سے کلی اسلام کی تصدیق کرنا۔

ایمانِ طریقت :۔ احکام خداوندی سے دلی تعلق کا نام ایمانِ طریقت ہے۔ اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک بندہ اپنے اخلاق کو اللہ کے اخلاق کے مطابق نہیں کر لیتا۔ اور لغویات، فضولیات اور لایعنی قول و فعل سے دستکش نہیں ہو جاتا۔ اسی مقام پہ اسے یکسوئی قلب اور اخلاص کی دولتِ لازوال حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ عبادت میں ایک حلاوت محسوس کرتا ہے۔

ایمانِ حقیقت :۔ اس صورت میں بندہ ہر حال میں ہمہ وقت بنیتاً تخیلاً، قولاً، عملاً اور قلباً متوجہ الی اللہ رہتا ہے ــــ مصیبت میں ہو خواہ راحت میں، بیماری میں ہو یا تندرستی میں تنگدستی میں ہو یا تونگری میں۔ اس کی حالت یکساں ہوتی ہے۔ اور وہ ان تمام چیزوں کو من اللہ سمجھتا ہے۔ اور مطمئن رہتا ہے۔ اس لئے کہ جب غلام کو معلوم ہو جائے کہ کوئی حکم اس کے آقا (اور وہ بھی مشفق) کی طرف سے ہے تو غلام کا کام ہے کہ اس کو بے چون و چراں ماننے اور ان احکامات کو اس دیانتداری سے مانے کہ آقا کی خوشنودی کی توقع ہو۔ اس مقام پہ بندہ کائنات کے تمام سود و زیاں کی ڈور اپنے مالک کے ہاتھ میں دیکھتا ہے۔ اس لئے وہ ہر حزن سے مُبرا ہو جاتا ہے۔

ذکر

ذکر تین قسم کے ہیں، ایک شریعت کا ذکر دوسرا طریقت کا ذکر اور تیسرا حقیقت کا ذکر۔

ذکرِ شریعت :۔ شریعت کا ذکر احکامِ خداوندی پہ عمل کرنا، اور جسے شریعت نے منع کیا ہے اس سے باز آئے اور جسے شریعت نے امر کیا ہے اس پہ مداومت رکھے اور یہ جو پانچ ارکانِ اسلام ہیں، تمام ذکرِ شرعی ہیں۔ نماز، زکواۃ، حج، خیرات، صدقہ، دینی اور مثبت علوم کی تدریس، ہر نیک بات اور نرم گفتگو وغیرہ سب اذکارِ شرعیہ سے ہیں۔

ذکرِ طریقت :۔ طریقت کا ذکر یہ ہے کہ لایعنی اعمال و اشغال سے باز رہے۔ اپنے اوقات کو لایعنی، فضول اور لغو باتوں میں صرف نہ کرے بلکہ مراقبۂ دل بسوئے ذاتِ اقدس رکھے اور غیر اللہ کے التفات سے بہر صورت بچے۔

ذکرِ حقیقت :۔ وہ دوامِ مشاہدہ ہے ، دوامِ معائنہ ہے ، دوامِ خوف ہے ۔ دوامِ امید ہے ۔ دوامِ فکر ہے ۔ دوامِ حیرت ہے ۔ یہی ہے حقیقت یعنی متوجہ الی اللہ رہنا ، بندہ نواہی کے معاملے میں اپنے مالک کے خوف اور رضا کو پیشِ نظر رکھے اور اوامر کے معاملے میں اس کی خوشنودی اور رضا کو اسی کا نام ہے امتثالِ اوامر ۔ للّٰہِ الواحد القہار

کفر لغوی معنی انکار کرنا ، ڈھانپنا اور اصطلاحی معنی وحدانیتِ الٰہی اور رسالتِ محمدیؐ کا انکار کرنا جزوی طور پر یا کلی طور پر ۔ کفر کی بھی تین حالتیں ہیں یعنی ایک شریعت کا کفر ہے ۔ وہ احکامِ خداوندی کو نہ ماننا ، انکار کرنا یا استہزاء کرنا ۔ اور اس کی دلیل تن فل تکاسل اور عناد ہے ۔ دوسرا طریقت کا کفر ہے ۔ جو احکامِ خداوندی پر قانونِ خداوندی پر اور قدرتِ خداوندی پر اپنی رائے اور اپنے اختیار کو قولاً یا فعلاً فضیلت دینا ہے اور تیسرا حقیقت کا کفر ہے ۔ وہ ذاتِ باری تعالےٰ سے صفاتِ باری تعالےٰ سے حیثیتِ باری تعالےٰ سے انکار ہے ۔ چاہے قولاً ہو چاہے فعلاً ۔ اللہ تعالےٰ ہمیں کفر کی ہر صورت سے پناہ میں رکھے ۔

صبر ایک صبر ہے ، ایک تصبّر ہے ۔ صبر یہ ہے کہ آدمی کو از خود کسی دوسرے کی بری بات یا عمل پر غصہ نہ آئے اور اس پر مخالفوں کی مخالفت اور دشمنوں کی دشمنی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ ہر دو حال میں توازن کا دامن تھامے ہوتا ہے ۔ پس یہی صبر ہے ۔ اور تصبّر یہ ہے کہ آدمی کو خلافِ طبیعت بات پر غصہ آتے اور وہ باوجود اختیار کے اپنے آپ کو ضبط میں رکھے اور جذبات میں نہ آوے ، یعنی نفس کو غصہ کی حالت میں قابو میں رکھے یاد رہے کہ صبر وہبی ہے اور تصبّر کسبی ہے ۔ اور مامور بھی ہے ۔ اس واسطے شریعت کی ہر چیز کا مدار احکامِ خداوندی پر ہے ۔ جس میں صرف جائز اور مثبت کی اجازت ہے اور ناجائز اور منفی کی اجازت نہیں ۔

طریقت کا صبر یہ ہے کہ لایعنی فضول اور لغو چیزوں کو چھوڑنا بلکہ ان کی طرف مائل تک نہ ہونا ۔ اور اگر کوشش کے باوجود طبیعت اس کی طرف مائل ہو تو صبر کرے ۔ لیکن اس پر

قابو کی اپنی سی سعی مسلسل کرنا رہے۔

حقیقتِ صبر :۔ کہتے ہیں کہ ہر چیز کا ایک جوہر ہوتا ہے۔ اور انسان کا جوہر عقل ہے اور عقل کا جوہر صبر ہے۔ پس صبر کرنا نفس کا مقابلہ کرنا ہے۔ مقابلے سے نفس میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔ صبر صابر کے جسم میں سانسوں کی طرح سرایت کئے ہوئے ہے کیونکہ اسے ہر ظاہری باطنی مذموم و مکروہ اور ممنوع چیز پہ صبر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور علم ان چیزوں کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اور صبر ان کو قبول کرتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ قبولِ صبر کے بغیر علم کی یہ رہنمائی نفع نہیں پہنچا سکتی (عوارف المعارف)

حقیقت کا صبر :۔ ذاتِ باری تعالےٰ کی طرف ہر آن متوجہ رہنا۔ صاحبِ صبرِ حقیقت پر پہاڑ بھی آپڑے تو وہ اپنی توجہ اپنے محبوبِ حقیقی پہ سے کبھی نہیں ہٹاتا۔ صبر کا یہ مقام بھی وہبی ہے۔

توجہ | توجہ دو قسم کی ہے ایک توجہ الی اللہ دوسری توجہ الی الھوا۔ توجہ الی اللہ حق بھی ہے اور انعام بھی اور توجہ الی الھوا باطل بھی ہے خسارہ بھی۔ ھوا کے آثار فسق و فجور، تکبر، بغض، حسد اور دیگر اعمالِ رذیلہ ہیں۔ گویا جو شخص ان چیزوں میں پھنسا ہوا ہے اس کی توجہ الی الھوا ہے اور وہ خاسرین میں سے ہے۔ اور توجہ الی اللہ کے آثار خوف، امید، حسنات، تسبیحات، تحمیدات، تہلیلات اور دیگر عباداتِ شرعیہ ہیں۔ گویا جو شخص اِن مذکورہ چیزوں سے منسلک ہے۔ اس کی توجہ الی اللہ ہے۔ اور یہی مقامِ بندگی ہے۔

اس کی تمیز کتابِ الٰہی اور سنتِ محمدی سے ہوتی ہے۔ اور صحبتِ شیخ اس میں نکھار اور اضافے کا باعث بنتی ہے۔ لیکن یہاں شیخ سے مراد نام کے شیخ نہیں بلکہ کام کے شیخ ہیں جن کی زندگیاں قرآن و سنت کے پورے پورے سانچوں میں ڈھلی ہوتی ہیں۔ ان کے پاؤں میں ڈوریاں بندھی ہوتی ہیں جن کے دوسرے سرے راہِ حق کے کھونٹوں سے بندھے

ہوتے ہیں۔ کہ ان کے دوسری کسی کھونٹ جانے کا سوال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہوتا ہے ـــــ اور بالفرض محال اگر کسی نے کوئی ایسا شیخ پکڑ لیا جس کا ناقص ہونا قرآن و سنتِ نبوی سے ثابت ہو گیا تو اسے چاہیئے کہ وہ کسی ایسے عارف باللہ سے رجوع کرے۔ جس کی تمام تر زندگی قرآن و سنت کے مطابق ہے۔ تجدید بیعت اس کے لئے ضروری بھی ہے اور نافع بھی۔ اور اس لئے بھی یہ انتہائی لابدی ہے کہ قرآن و سنت کے لطائف اور حقائق اور اخلاص طالب کتابوں کی مدد سے حاصل نہیں کر سکتا؛ وہ تو دو اچھائیاں اور دو برائیوں میں بھی بسا اوقات تمیز کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔ توازن کا راستہ اور اس پہ اخلاق سے گڑ جانا بغیر عارف باللہ کی توجہ کے ممکن نہیں۔ اور عارف باللہ وہی ہے جو احوالِ محمدیؐ کے قدم بقدم چلتا ہو اور ایمانِ کامل اور معرفتِ مصطفےٰ سے متصف ہو، جس کا قرب ترقی ایمان کا باعث بنے اور جو مرید کی راہِ حق کے وساوس کو دور کرنے پر قادر ہو۔ اور اس کی قربت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ترقی کا باعث بنتی ہو اور یہ کہ وہ بندے کو رب سے ملا دینے پر قادر ہو۔

یاد رہے کہ زندگی میں مطلوبہ توازن احکاماتِ خداوندی اور سنتِ محمدیؐ پر عمل پیرا ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ اور توازن کے بغیر آدمی غافل ہے اور جو غافل ہے وہ ناقص ہے اور جو ناقص ہے وہ محروم ہے اور جو محروم ہے وہ برباد ہے۔ اور یہ نقطہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان جو حجاب ہے، اسی کا نام غفلت ہے۔ اور یہ غفلت کبھی معنوی ہوتی ہے اور کبھی علمی ـــــ غفلتِ علمی غلیظ اور غفلتِ معنوی اغلظ ہے۔ عمل سے پہلے نیت کرنا ازبس ضروری ہے۔ جیسے کوئی شخص بغیر نیت کے وضو کرے یا بغیر نیت کے نماز پڑھے، ہر دو بے معنی ہیں۔ گناہ اور ثواب کا دارومدار نیت پہ ہی ہے۔ اسی لئے "اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات" کہا گیا۔ آدمی ثواب کو اس وقت صحیح پاتا ہے۔ جب نیت بھی صحیح ہو اور عمل بھی صحیح ہو اور جب کسی مومن سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے۔ اور وہ توبہ کرتا ہے

تو اسے اللہ تعالےٰ کی صفتِ غفور سے حصہ ملتا ہے۔ اسکی تکمیل خالص توجہ سے ہوتی ہے۔ پھر توجہ ایک شریعت کی ہے جس میں ناجائز چھوڑنا ہوتا ہے اور جائز کرنا ہوتا ہے۔ ایک طریقت کی توجہ ہے جس میں لایعنی اور فضولیات کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اور ایک حقیقتِ عظمیٰ کی طرف توجہ مرکوز کرنی ہوتی ہے۔ اور غیر اللہ سے قطع پیوند کرنا ہوتا ہے۔ اور ایک توجہ حقیقت کی ہوتی ہے۔ جو سراپا بندگی ہے۔ اور یہی مقصودِ حیات ہے۔ اور یہ وہی ہے ہم توجہ کی اس طرح تین قسمیں کر سکتے ہیں۔

۱۔ ضروری توجہ ۲۔ اصلاحی توجہ ۳۔ غایت توجہ

ضروری توجہ

وہ اسم ذات کا نور ہے جس سے قلبِ مرید میں پیر کی ہمت سے اثرانگیزی پیدا ہوتی ہے۔ اور پیر اس قلب پر اس حد تک توجہ کرتا ہے کہ ظرفِ قلبِ مرید اس نور سے بھر جاتا ہے اور یہ انعامِ عظمیٰ صاحبِ سلسلہ طریقت لوگوں کا ہی مقدر ہے۔ مستثنیات ہر جگہ پائی جاتی ہیں، اور بے سلسلہ اور مخالفِ سلسلہ اس انعامِ عظیم سے محروم ہیں۔

اصلاحی توجہ

اصلاحی توجہ یہ ہے کہ ذکر و فکر اور اطاعتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر توجہ رکھے تاکہ قلب غفلت کی بیماری سے شفا پاکر صالح ہو جائے۔ اور اس نور سے اس کو اطاعت میں فائدہ پہنچ جائے۔ اس میں شیخ کی توجہ مُرید کی توجہ میں پروانہ کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔

غایت توجہ

غایت توجہ یا معراجِ توجہ یہ ہے کہ مرید غلبۂ فیض کو غلبۂ نور سے حالتِ سکر میں آجائے۔ اور اس پر حال غالب ہو جائے جو یقیناً غیر اختیاری ہے، اور اس مقام پر طالب حق اپنی کیفیات میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دیوانہ، یہی مقام فنا فی اللہ یعنی متوجہ الی اللہ۔ بقا باللہ یعنی دوام حضور اور تمام تر مشاہدہ اور تمام تر معائنہ۔ توجہ کی مزید تین قسمیں یہ ہیں ایک توجۂ شریعت جو مکمل

اتباعِ سنت ہے اور اسلام کے پانچوں ارکان پر قولاً و فعلاً گٹھ نالبطر زِ فیضِ مدنی یعنی سنتِ محمدی اور توجہ طریقت جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا۔ ناجائز، لایعنی، فضول، لغو اور تمام منفیات نیز مباح اور غفلت سے نکل کر قلب کو اللہ کی طرف متوجہ کرنا۔ توجہ حقیقت جو خالصتاً استغراقی اور وہ فنائے عامہ ہے پھر مزید اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجذوب یعنی صاحب صحو اور ایک سالک یعنی صاحبِ محو یعنی بے خود اور یہ کیفیت وہبی ہوتی ہے۔ اور کسبی نہیں ہوتی" یعنی اس کے حصول میں ذاتی انفرادی اور شخصی ریاضت اور دوڑ دھوپ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کا خلاصہ دوامِ ذکر، دوامِ حضور، دوامِ فکر، دوامِ توجہ اور دوامِ دلیل ہے۔ اور اسلام میں جو عبادات ہیں مثلاً حج، صلوٰۃ، روزہ، زکوٰۃ، صدقات، نرم گفتاری، تحمیدات، التحیات، تسبیحات، تجیدات یہ سب اللہ تعالےٰ کے ذکر میں شمار ہوتے ہیں اور ان اذکار سے اللہ تعالےٰ کی ذات کا دھیان پختہ ہوتا چلا جاتا ہے اور انسان اس کی کبریائی سے غافل نہیں ہو پاتا اور انسان کی عظمت کا راز بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ میرے سامنے عاجزی اختیار کرو، میں لوگوں کے دلوں میں تمہاری عظمت بٹھا دوں گا۔ اور بے شک عزتوں اور ذلتوں کا وہی دینے والا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ ہر وقت اللہ تعالےٰ کی عظمت بیان کرتا رہے اور جب وہ زمینوں اور آسمانوں میں غور کرے گا۔ تو یقیناً اللہ ہی کی عظمت و کبریائی کو پائے گا۔ زمین و آسمان میں اس کے حکم کی بجا آوری میں توجہ کرنا بھی ذکر میں شامل ہے۔ یہاں ایک بات ذہن نشین رہے اور وہ یہ کہ اللہ سبحانہٗ تعالےٰ کے اخلاق میں سے کبر ایک ایسا واحد خلق ہے جسے اپنے خلیفہ کو نہیں دیا گیا۔ اور صراحتہً کہہ دیا گیا ہے کہ کبر میری چادر ہے۔ اس پر کوئی ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہ کرے۔ اور ویسے بھی منی کے ایک غلیظ قطرے سے پیدا ہونے والے انسان کو کبریائی زیب بھی کیسے دے سکتی ہے۔ کبریائی تو اسے زیب دیتی ہے جو کسی کے آگے مجبور نہیں بلکہ جس کے آگے سب مجبور ہیں ــــــ مالکِ حقیقی کے ادنیٰ سے ادنیٰ حکم کو بجا لانا بھی ذکر ہے۔ اور اگر اللہ تعالےٰ کی

عبادت کرتے وقت اس کی عظمت و کبریائی پیشِ نظر نہ رہی اور اس کے سامنے اپنی حقارت و ذلت کے نقوش نہ ابھرے تو یہ غفلت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان بہت بڑا حجاب ہے اور قلب کا بہت بڑا مرض ہے غفلت اور غفلت کے بعد صرف کفر ہی رہ جاتا ہے اور اگر غور و خوض سے کام لیا جائے تو غفلت کا دائرہ وسیع نکلتا ہے اور کفر غفلت ہی کا ایک شعبہ قرار پاتا ہے۔ جس کے دل سے غفلت اٹھ جاتے اور وہ متوجہ الی اللہ رہے، وہی ذاکر، شاکر اور فاکر ہے۔ اور اس کے ایمان کا مقام ارفع ہے۔ اور اس کا یہ ذکر عذاب الٰہی سے سببِ نجات ہے اور وہی صاحبِ عقلِ سلیم ہے جو عذاب الٰہی سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور اپنے دامن پر غفلت کی گرد تک نہیں بیٹھنے دیتا۔ یاد رہے عذاب بقدرِ غفلت ہے اور اس کے مقابلے میں بیداری جتنی زیادہ ہو گی۔ اسی نسبت سے وہ خوشنودیٔ الٰہی کا مستحق ٹھہرے گا۔ لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ ہر وقت بیدار رہے اور اس کی توجہ اللہ سے ہٹنے نہ پائے اور وہ اپنے مقصدِ حیات "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" کے مطابق دنیا کے دار العمل میں عمل پیرا ہو۔ یہی عقل بیدار ہے اور اسی کے حامل کو مردِ ایماندار کہتے ہیں۔

کفر کے معنی مزید

کفر کی نسبت اگر اللہ کی طرف کی جائے تو یہ حکمت ہے۔ اور اگر انسان کی طرف کی جائے تو آفت ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی جلالی صفات کے اسماء یعنی قہار، جبار، منتقم، مذل اور خافض وغیرہ اس کے جلال کے مظہر ہیں۔ اور جمالی اسماء مثلاً رحمان، رحیم، کریم، رؤف، معز، معطی وغیرہ اس کی جمالی صفات کی نشاندہی کرتے ہیں ـــــ تو گویا کفر بہ نسبتِ انسان آفت اور بہ نسبت الٰہی، جلالی حکمت اور ایسی مشیت ہے جس میں اصلاح کا پہلو مضمر ہے۔

انسان نہ کلی طور پر مجبورِ محض ہے اور نہ مختارِ مطلق۔ اس کو ایک اختیار بھی حاصل ہے (چاہے وہ محدود ہی سہی) انسانی اختیارات میں سے یہ بھی ہے کہ حق و باطل کے جس دروازے پر دستک دینا چاہے اور جس میں داخل ہونا چاہے۔ ہو جائے۔

قرآن و سنت کی تعلیمات سے بھی یہی مستفاد ہوتا ہے کہ اسلام کی سعادت سے اسے ہی نوازا جاتا ہے ۔ جس کے دل میں اس کی خواہش ہوتی ہے ۔ اللہ رب العزت اتنی بڑی دولت انسان کو خواہش کئے بغیر نہیں دے سکتا ۔ پھر بغیر خواہش کے دینا عزت کے خلاف ہے جب کہ اللہ سے بڑھ کر کسی دوسرے غیور کا تصور بھی محال ہے ـــــــ ویسے بھی تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی بعثت ، مجددین ، مجتہدین ، صالحین اور دیگر ہادیان دین و مذہب کا ایک سلسلہ خود اس چیز کی دلیل ہے کہ حق و باطل اختیاری چیزیں ہیں ۔ اور ان مذکورہ بالا ہستیوں کی تواتر سے آمد کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان کی اتباع کی جائے اس لئے کہ وہ دین کے عالم اور عامل ہیں ۔ اور ان کی زندگیاں عملی شرحِ دین ہیں طالبِ حق کو چاہیئے کہ وہ جتنی ذات کا مالک ہے اس کے وجوب سے ذاتِ باری تعالیٰ کا خیال کرے کیونکہ یہ مخلوق ہے اور مخلوق کے لئے خالق کا ہونا لابدی ہے ، اگر مخلوق نہ ہوتی تو خالق کہاں سے پہچانا جاتا ۔ نیز اگر مخلوق نہ ہوتی تو ربوبیت کا مقصد تشنۂ تکمیل رہ جاتا ۔ یہ تمام اختیارات قدرت کے قبضہ میں ہیں ۔ اور اس کا دارو مدار صفائی باطن پر ہے اور صفائی باطن کا مدار شریعتِ محمدی پر ہے ۔ اس کا عمل اخلاص پر ہے ۔ اور یہ اخلاص اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک عمل میں نفس کا حصہ ہوتا ہے ۔

عبادت کے معنی مزید

عبادت کے معنی ہیں بندگی ۔ جو لوگ عبادت کی کیمیا گری سے واقف نہیں اور بزعمِ خود اپنے آپ ہی کو مسجود سمجھتے ہیں وہ اولیائے طاغوت ہیں اور اللہ کے دشمن ۔ خالی بالطبع شخص جس کا کوئی مذہب نہ ہو ، کوئی دین نہ ہو ، کوئی نظریہ نہ ہو ، وہ بھی جب تعصب اور غیر جانبداری سے علیحدہ ہو کر سوچے گا تو یقیناً اللہ کی معبودیت اور اپنی عبدیت کا مُقر ہوگا ۔ اس کائنات کا ایک ایک ذرہ اللہ تعالےٰ کی بندگی میں مصروف ہے خواہ وہ عام اصطلاح میں ذی روح ہو یا غیر ذی روح ـــــــ پھر لوازم بندگی بذاتِ خود ایک عبادت ہے ۔ بندہ جتنا اللہ کے

کے سامنے خود کو ذلیل، ادنیٰ اور عاجز سمجھتا ہے اور اپنی خواہشات کو جتنا مسلتا ہے اور جتنا اپنے نفس ہی کو پامال کرتا ہے۔ وہ اسی نسبت سے اپنے رب کی نظر میں عزت و قبولیت پاتا ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں (اقبالؒ)

اللہ تعالےٰ کو ہر وقت حاکم، مالک، عالم، قادر، رزاق، حافظ، کریم، رحیم، سمیع بصیر وغیرہ صفاتِ جلالیہ، جمالیہ، کمالیہ اور نوالیہ وغیرہ سے پکارنا عین اسی کو پکارنا ہے۔ قرآن کریم میں خود اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ج

کہہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو جو کہہ کر پکارو گے سو اسی کے ہیں سب نام خاصے (سورۂ بنی اسرائیل)

اللہ تعالےٰ نے اپنے ظہور اور اپنی پہچان کے لئے اس کائنات کو تخلیق کیا۔ اب بندے کا فرض ہے کہ اس میں غور و خوض کرے اور خالقِ کل کی شان کو پہچانے۔ یہ شانِ خداوندی مختص ہے اللہ ہی کے لئے اور اس میں ماسوا اللہ شریک نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی کوئی دوسرا اس شان کے لائق ہے۔ وہ اپنی شان اور قدرت میں یکتا، یگانہ اور ناپید ہے۔ ماہی سے ماہ تک یعنی تحت الثریٰ سے لامکاں تک سب عالم خلق ہے۔ سب محتاج ہیں سب اللہ کے بندے ہیں اللہ ہی ان کو پالتا ہے۔ اللہ ہی جب چاہتا ہے ان کو زندگی دیتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے موت سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ تو انسان کو چاہیئے کہ بھروسہ صرف اور صرف ذاتِ خداوندی پر رکھے۔ اور ماسوا اللہ کے سامنے خود کو ذلیل و رسوا نہ کرے ــــــ معاملاتِ ذاتِ خداوندی جتنے ہیں وہ ذرائع ہیں، واسطے ہیں، اسباب ہیں، تو یہ نظامِ کائنات اسباب سے ذرائع سے اور واسطے سے چلتا ہے ــــــ لاریب لائقِ عبادت اور لائقِ تعریف و توصیف فقط ذاتِ باری تعالےٰ ہے کوئی دوسرا

اس صفت کے لائق نہیں ۔ یہی ہے عقیدۂ توحید، جو جانتا ہے اس پر عمل کرتا ہے۔ جو نہیں جانتا وہ محروم ہے۔ اللہ کا کرنا صرف ایک لفظ سے ہوتا ہے اور یہ لفظ ہے "کُن" (ہو جا) وہ جس چیز کا وجود چاہتا ہے۔ بس صرف "کُن" کہتا ہے اور وہ ہو جاتی ہے اسی طرح وہ جسے فنا کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے بھی اس کا ایسا ہی حکم ہے۔ تصرف امرِ خداوندی سے ہے اور امر، تعلق سے ہے حیثیت کے ساتھ اور حیثیت کا تعلق ارادے کے ساتھ ہے اور ارادے کا تعلق ہے ذات کے ساتھ بعض علماء کے نزدیک حیثیت اور ارادہ ایک ہی چیز ہے اور بعض کے نزدیک علیحدہ علیحدہ۔

صوفی

صوفی کون ہے؟ وہ مومن جو آدابِ شریعت کی حفاظت کرتا ہو۔ حرام کا خیال بھی اپنے پاس بھٹکنے نہ دیتا ہو یہاں تک کہ شبہ والی شے سے بھی اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہو۔ اپنے حواس کو لواہی سے بچاتا ہو اور غفلت کے ہر حربے سے بچتا ہو۔ اس کا ہر سانس اللہ کے نور کی خوشبو میں بسا ہوا ہو۔ اس کے اصول ضرورت اور غیر ضرورت کے وقت یکساں ہوں۔ وہ شہوات کے خلاف ہر لمحہ نبرد آزما ہو۔ وہ محبوبِ حقیقی کی عبادت دوزخ کے خوف یا جنت کے صلے کی خاطر نہ کرتا ہو۔ جس طاعت و عبادت میں عام طبیعتیں سستی اور بے رغبتی محسوس کرتی ہیں۔ صوفی اسے اپنے لئے چیلنج سمجھتا ہے اور مردانہ وار اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ یاد رہے کہ کرامت کی خواہش عبادت کی مزدوری ہے۔ جس کا رشتہ نفس سے جا ملتا ہے۔ ہاں اگر مالکِ حقیقی خوش ہو کر طالبِ حق کو سیف زبان کر دے اور اس کی دعائیں بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہونے لگیں۔ تو اس میں صوفی کے لئے کوئی ضرر نہیں بلکہ یہ انعامِ الٰہی ہے۔

صوفی دو قسم کا ہوتا ہے ایک ابن الوقت اور ایک ابو الوقت ـــــ ابن الوقت صوفی وہ ہے کہ اس پر جو بھی وقت آئے وہ اسی میں مشغول رہتا ہے اور وقت اس پر غالب رہتا ہے۔ اور ابو الوقت صوفی وہ ہے جو وقت پہ غالب ہو۔ وہ وقت کا تابع

نہیں ہوتا بلکہ وقت اس کا تابع ہوتا ہے۔ اس کا اپنا ایک رنگ ہوتا ہے اور وہ کسی اور رنگ میں رنگا نہیں جاتا —— وہ صاحبِ حال، صاحبِ مقام، صاحبِ تلوین اور صاحبِ تمکین ہوتا ہے۔ یہ وارداتِ غیبی سے متاثر ہوتا ہے اور جہاں تک "ضبط" کی بات ہے تو وہ صرف صاحبِ تمکین ہی کر سکتا ہے اور صاحبِ تلوین نہیں کر سکتا۔ صاحبِ تلوین جزا و سزا سے ناآشنا ہوتا ہے۔ اور صاحبِ تمکین سے کچھ بھی باہر نہیں وہ تو جاذب ہے۔ دریائے معرفت ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اسے پی جائے گا۔ اور اس کے ہونٹ پھر بھی خشک رہیں گے۔ مگر صاحبِ تلوین معرفت کا ایک گھونٹ بھی برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

پیری مریدی

پیری مریدی کا بنیادی مقصد بجز اس کے کچھ نہیں کہ طالبِ حق کی ذات کی جملہ ظلمتوں کو دور کر کے اس کے باطن کو جلا بخشی جائے اور اس کا ماسوا اللہ سے ہر قسم کا تعلق توڑ دیا جائے اور تکبّر کے احتمال تک سے بھی اس کو پاک کر دیا جائے۔ تاکہ جب اسے سرِّ الٰہی سے نوازا جائے تو وہ اس کا متحمل ہو سکے۔

ان چودہ سو سالوں میں صرف رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ایسا زمانہ تھا کہ طالبِ حق کو شیخِ تربیت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اور منجملہ دوسرے معجزات کے یہ بھی سرورِ دوجہاں کا ایک معجزہ تھا۔ علاوہ ازیں اس دور میں مسلمانوں کی طبعیتیں ہی کچھ ایسی واقع ہوئی تھیں کہ ہر لمحے وہ حق کے متلاشی ہوتے تھے اور ان کا سونا جاگنا یکساں طور پہ عابدانہ اور زاہدانہ ہوتا تھا۔ اس دور میں خیر ہی خیر تھی۔ نورِ حق ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ان کے علمِ معرفت کو کون شخص پہنچ سکتا ہے۔ جنہیں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے نجومِ فلک سے تشبیہہ دی ہو۔ اسی لئے انہیں شیخِ تربیت کی حاجت نہیں ہوتی تھی البتہ پیری مریدی کی ایک شکل اس وقت بھی موجود تھی۔ وہ اس طرح کہ صاحبِ سرِّ الٰہی اپنے سر کے وارث کو پہچان کر اس کے کان میں کوئی بات کہتا اور اسے اسی لمحہ فتح

نصیب ہو جاتی۔

خیر القرون زمانۂ محمدیؐ کے بعد جوں جوں لوگوں کے باطن میں صفائی کی جگہ ظلمت نے لینی شروع کر دی توں توں پیری مریدی کی ضرورت شدت پکڑتی گئی اور تربیت کا عمل سخت سے سخت تر ہوتا چلا گیا۔ اقتضائے زمانہ کے ساتھ ساتھ تربیت کے کئی دبستان وجود میں آئے پھر وہ دور آیا جو ہمارا دور ہے۔ جس میں حق و باطل ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح اُلجھ گئے ہیں کہ ان کو الگ الگ کرنا بذاتِ خود ایک مجاہدۂ کبیر ہے۔ آج کے دور میں بدعات کی گرم بازاری ہے۔ قرآن و سنت کی عملی زندگی کے حاملین بتدریج عنقا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میری نظر میں اس دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ تصوف کو ایک کاروباری شکل دے دی گئی ہے۔

اس دور میں چونکہ شیطنت کی گرم بازاری ہے۔ اس لئے شیخ کو چاہیئے کہ وہ مرید کو شریعت کے راستے سے سلوک کے مدارج طے کرائے اور مرید میں احکام خداوندی کی بجا آوری کی لگن پیدا کر دے اور بتدریجاً احکام الٰہی کی تکمیل کرائے۔ آج کے دور میں تعمیلِ خداوندی کا راستہ ہی واحد بے خطر راستہ ہے۔ جس پر عمل پیرا ہو کر مرید اپنے باطنی سرمائے کو ابلیسی سوسائٹی کی دستبرد سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

احکام شرعی

احکام شرعی درج ذیل ہیں۔

فرض، واجب، سنت، نفل، مستحب، مباح، مکروہ، حرام۔

فرض

جو دلیلِ قطعی سے ثابت ہے اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اس پر عمل کرنا ثواب ہے۔ اور بغیر عذر کے ترک کرنے والا فاسق اور مستحق عذاب ہے۔ اور انکار یا استہزا کرنے والا کافر۔ مثلاً پنج وقتہ نماز پڑھنا یا رمضان کے روزے رکھنا اور پیسے ہوں تو زکوٰۃ دینا اور حج کرنا، یہ سب فرائض ہیں، ان کے کرنے میں ثواب ہی ثواب ہے اور بغیر عذر کے نہ کرنے میں عذاب ہی عذاب ہے۔

واجب وہ امر جو دلیلِ ظنی سے ثابت ہو واجب ہے۔ اور اس کا حکم عمل کرنے میں فرض جیسا ہے اور نہ کرنے میں کفر تو نہیں ہے البتہ مستحق عذاب ہے۔ مثلاً نمازِ عشاء کے وتر۔ ان وتروں کا چھوٹ جانا گناہ تو ہے لیکن کفر نہیں ہے۔

سُنّت وہ امر ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل میں رکھا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ترک بھی کیا ہے۔ سنت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سنتِ موکدہ اور دوسری سنتِ غیر مؤکدہ ـــــ سنتِ موکدہ وہ ہے جسے ہمیشہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تواتر سے اپنائے رکھا۔ اور سنتِ غیر موکدہ وہ ہے جس پر کبھی عمل کیا اور کبھی نہ کیا۔ مثلاً نمازِ عشاء میں فرض اور وِتر کے درمیان دو سنتیں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تواتر سے پڑھتے رہے۔ اس لئے سنتِ موکدہ ہوئیں اور اسی نماز میں فرضوں سے پہلے چار سنتیں کبھی پڑھیں اور کبھی نہ بھی پڑھیں۔ اس لئے یہ غیر مؤکدہ ٹھہریں۔ سنتِ مؤکدہ چھوڑنا گناہ ہے اور اسے سُبک سمجھنا کفر ہے۔ جب کہ سنتِ غیر موکدہ کو چھوڑنا گناہ نہیں۔ اس پر عمل کرنے والا یقیناً ثواب کا مستحق ہے ـــــ ادب اور تعلقِ محمدی کا تقاضہ یہ ہے کہ سنتِ غیر موکدہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ترک نہیں کرنا چاہیئے۔ لیکن اسے سنتِ موکدہ کے تواتر کی طرح بھی نہیں پڑھنا چاہیئے۔ اس لئے یہ بھی طریقِ محمدی کے ادب کے خلاف ہے۔

نفل اور مُستحب اِن کا اطلاق ایسے اعمال پر ہوتا ہے۔ جن کے کرنے میں ثواب ہو اور چھوڑنے میں عذاب نہ ہو۔ مثلاً تمام نمازوں کے نوافل، مستحب کا کرنے والا افضیلت کا حامل ہو گا مگر چھوڑنے والے پہ عتاب و عذاب کچھ نہیں ثواب کے لحاظ سے نفل کا درجہ مستحب سے بڑا ہے۔

مباح وہ ہے جس میں نہ ثواب ہو نہ عذاب۔ اور جس کے لئے نہ حکم امر ہے نہ نہی منہیات تین قسم کے ہیں۔ (۱) حرام (۲) مکروہِ تحریمی (۳) مکروہِ تنزیہی۔

مکروہ — مکروہ وہ ہے جس میں کراہت ہو اس کی دو قسمیں ہیں مکروہِ تنزیہی، مکروہِ تحریمی۔

مکروہِ تنزیہی — وہ ہے جس کی ممانعت بطور شفقت ہو یا ادباً ہو نیز وہ ہے جس سے بچنے میں ثواب ہو اور کرنے میں عذاب تو نہ ہو البتہ اس کے کرنے کو برا سمجھا جاتا ہو۔

مکروہِ تحریمی — وہ ہے جو حرام کے قریب ہو۔ یہ بھی ظنّی دلیل سے ثابت ہوتا ہے عذر میں یہ بھی جائز ہے۔ اس کا منکر فاسق اور بلا عذر کرنے والا گنہگار اور مستحقِ عتاب۔

حرام — وہ امر ہے جسکا دلیلِ قطعی سے منع ہونا ثابت ہے اس کے کرنے میں عذاب ہے۔ اور اس سے بچنے میں ثواب ہے۔ البتہ اگر عذر درپیش ہو تو حرام بقدرِ حیات جائز ہے، جیسے تین دن کے فاقے کے بعد یا جنگل و صحرا میں کوئی حرام جانور یا کوئی اور حرام شے دستیاب ہو۔ اور اس کے کھانے سے جان بچ سکتی ہو، یا کسی مہلک بیماری میں کسی حبید طبیب کا کسی حرام شے کھانے کا مشورہ دوا کے طور پر چونکہ یہ سب جائز ہیں۔

فرض اور حرام کے دو پہلو — فرض اور حرام کی دو قسمیں یہ ہیں
(۱) اعتقادی (۲) عملی

اعتقادی میں عمل اور اعتقاد دونوں لازم و ملزوم ہیں یعنی عمل کے ساتھ ساتھ اعتقاد بھی فرض ہے جیسے مطلق سر کا مسح، یہ چاروں اماموں کے یہاں متفق علیہ ہے۔ اگر کوئی اس کا انکاری ہو تو وہ آئمہ اربعہ کے نزدیک کافر ہے۔ ایسا فرض اور حرام جس سے انکار پر کفر لازم ہو جاتا ہے اس سے مراد اعتقادی ہے۔ اور عملی سے مراد یہ ہے کہ جو صرف عمل کی حد تک فرض ہو یعنی اس کے فوت ہو جانے پر صرف عمل کی صحت فوت ہو جیسے کہ مقدارِ مسح سر کا اختلاف

کہ احناف کے یہاں چوتھائی سر سے کم کا مسح جب کہ حنابلہ اور مالکیوں کے یہاں سارے سر کا مسح صحتِ وضو کا مانع ہے۔ لہٰذا اس میں اختلاف باہمی کفر نہیں۔ اسی طرح نمازوں کے اوقات کہ شافعی حضرات نماز اول اوقت میں پڑھتے ہیں جب کہ حنفی حضرات آخری اوقات میں۔ نماز کے اوقات چاروں اماموں کے یہاں ایک ہی ہیں البتہ اول آخر کا اختلاف ہے۔ اور اس میں سے کسی کا بھی اختلاف باہمی کفر نہیں۔

معرفت

جس نے اس دنیا کو تین طلاقیں دے دیں۔ اپنے نفس کو قتل کر ڈالا، غیر اللہ سے کلیتہً بیلحدگی کا اعلان کر دیا۔ نیز یہ کہ جس نے رنج وغم کی کفنی پہن لی، صدق وصفا کی چادر اوڑھ لی، توکل کا لباس زیبِ تن کر لیا۔ نیز یہ کہ اس نے اپنے ظاہر کو شریعت کے تالاب میں نہلایا اور اپنے باطن کو محبت کے سمندر میں غوطہ زن کیا۔ اور یہ کہ اس کی زلیت کا ہر امر اور ہر نہی مالک کے حکم کے تابع ہے۔ وصل کی خاطر تڑپنا اس کا وظیفہ ہے۔ اور دار المزید اس کی منزل۔ وہ اس دنیا میں بھی اللہ ہی کی ذات میں گم ہوتا ہے اور دوسری دنیا میں بھی اللہ ہی کی ذات میں گم ہوگا۔ اسی کا نام معرفت ہے۔ اور ان اوصافِ حمیدہ سے متصف کو عارف کہتے ہیں۔

معرفت کی تین اقسام

ایک شریعت کی معرفت ہے۔ ایک طریقت کی معرفت اور ایک حقیقت کی معرفت۔

شریعت کی معرفت :۔ از روئے شرحِ محمدی جائز کو پہچاننا اور اس کے مطابق عمل کرنا ناجائز کو پہچاننا اور اس سے بچنا۔

طریقت کی معرفت :۔ غیر مقصود چیزوں کا علم رکھنا اور ان سے اجتناب کرنا اور اللہ جلّ جلالہٗ سے خوف وامید کا معاملہ رکھنا۔

حقیقت کی معرفت :۔ وہ ذات باری تعالٰی میں ایک دائمی حیرت ہے۔ چنانچہ نہ کیف ہے نہ مثل، نہ چون ہے نہ گون، نہ رنگ ہے نہ ظرف نہ جہت ہے نہ بالا یعنی یہ عالمِ امکانی

کی صفات سے ماوراء ہے۔

توحید | توحید کے معنی ایک جاننا، ایک ماننا، ایک پر یقین رکھنا اور وہ ذات اقدس "اللہ" ہے جو اپنی ذات میں ایک، صفات میں ایک، شیونات میں ایک اسماء میں ایک افعال میں ایک، تصرفات میں ایک، ملک میں ایک، قدرت میں ایک، حیات میں ایک، علم میں ایک، طاقت و قوۃ میں ایک، بصر میں ایک، بصیرت میں ایک سمع میں ایک رحمانیت و رحیمیت میں ایک، قہاریت و جباریت میں ایک، ارادت و تخلیق میں ایک، مشیت و امر میں ایک علیٰ ہذا جمیع صفات میں وہ تنہا و یکتا ہے، ہر مخلوق اس کے سامنے جواب دہ ہے۔ مگر وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں۔ ہر مخلوق اس کے سامنے عاجز ہے مگر وہ کسی کے سامنے عاجز نہیں۔ مختصر یہ کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔

توحید تین قسم کی ہے ایک اہلِ تشبیہ کی توحید، یہ فرقہ اللہ تعالےٰ کے لئے مخلوق جیسی صفات ثابت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے بھی ہاتھ پیر ہیں۔ ہماری ہی طرح سنتا، دیکھتا اور جانتا ہے۔ یہ اللہ کی توحید کے لئے انسانوں والا ہی اسلوب اختیار کرتا ہے۔ لاریب یہ گمراہ فرقہ ہے۔

توحید کی دوسری قسم اہلِ تعطیل نے پیش کی۔ یہ فرقہ "معطل" اللہ تعالےٰ کے لئے نہ مخلوق جیسی صفات کا قائل ہے اور نہ ہی ایسی صفات کا جو اللہ رب العزت کے شایانِ شان ہیں بلکہ جن صفاتِ کمال کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے ان کی تفسیر بھی نفی ہی سے کرتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے قادر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عاجز نہیں۔ علیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جاہل نہیں وہ یہ مطلب نہیں مانتا کہ اللہ تعالےٰ میں علم اور قدرت کی صفت موجود ہے۔

اس فرقے کی توحید یہ ہے کہ اس کی سعی اس کی کوشش، اس کا دھیان، اس کی توجہ اور اس کا اعتقاد عدم تک چلا جائے۔ یعنی صفات سے انکار اور ذات کا تعطل اہلِ تعطیل کی توحید ہے۔ یہ بھی صریحاً گمراہی ہے۔

تیسری قسم کی توحید موحدین اور مخلصین الی اللہ کی ہے۔ جو چون اور گون، کیف اور مثل، رنگ اور بو، قد اور رقاب، طول اور عرض اور اس قسم کی تمام دوسری قیود و حدود سے باہر ہے۔ یہی موحدین کی توحید ہے اور یہی صحیح ہے اور یہ ایمان ہے اور اس پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا۔

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ،

اللہ کی مثل کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ آنکھیں اسکو دیکھ نہیں سکتیں

درحقیقت **اصل توحید** تک پہنچنا ناممکن کی حد تک مشکل ہے۔

یہ اللہ کا لاکھ لاکھ کرم ہے کہ وہ کسی کو ظرف سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ پس جس شہادتِ توحید کا اللہ تعالےٰ انسان سے مطالبہ کرتا ہے۔ اسلام سے اتنا حصہ بھی اس کیلئے نافع ہے۔ اس طور پر کم ازکم وہ منکرین کی فہرست سے تو نکل جاتا ہے۔ رہا مومنوں اور کاشفوں کے زمرے میں شامل ہونا تو یہ ایک جانکاہ کام ہے۔ جو عامی کے بس سے باہر ہے۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا۔

گاؤں والے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے فرمادیجئے تم ایمان نہیں لائے ہاں یوں کہو کہ تابع فرمان بن گئے

پھر ہر عارف کی توحید اس کے مقام اور درجے کے مطابق ہے جس کا دارومدار اس کے کشف پر منحصر ہے۔ رہی حقیقی توحید کی آگہی تو اولیاء اللہ کی تو بات ہی چھوڑو، انبیاء اس تک پہنچنے میں عاجز دکھائی دیتے ہیں۔ دلیل کے طور پر حاملِ کونین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالےٰ کا یہ کہنا پیش کیا جاسکتا ہے "وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا" رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دعا منگوانا دلیل قطعی ہے کہ ہر روز نہ بلکہ ہر پل آنحضرت کے علم کو بڑھایا جاتا رہا ہے اور توحید کی طرف قریب سے قریب تر لایا جاتا رہا۔

احدیت — مرتبہ لاتعین فقط ذاتِ اقدس بغیر تعین اسماء وصفات

مرتبہ وحدت

یہ مرتبہ تعین اولیٰ ہے۔ جو ذاتِ اقدس صفات محمودہ پر موصوف ہوا۔ اور اسماءِ گرامی پر موسوم ہوا۔ اس کو تعین اولیٰ کہتے ہیں۔

واحدیت

یہ مرتبہ تعین ثانی کہلاتاہے۔ جو مقام کثرتِ خلقت ہے۔ سب سے پہلے اللہ پاک نے جو مخلوق پیدا کی وہ حقیقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھی۔ اسی کو برزخ کبریٰ، تعین ثانی، حقیقتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور روحِ اعظم کہتے ہیں۔ اسی روحِ اعظم سے اللہ تعالےٰ نے تمام مکان، تمام مخلوق اُن کی خاطر پیدا کی اور حقیقتِ محمدی کو رحمتِ مصورہ بناکر نازل فرمایا۔ اور ذریعۂ نمود ہدایتِ مخلوق بنایا۔ بلاشک وشبہ زمین کا ہر راز نورِ محمدی کا رہینِ منت ہے۔ یہ تمام سبزہ وشجر کی خوشنمائی اور خوشبو نورِ نبی ہی کا صدقہ ہے۔ اس مقام پر دلائل الخیرات کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

وَبِالْاِسْمِ الَّذِیْ وَضَعْتَہٗ عَلَی اللَّیْلِ فَاَظْلَمَ وَعَلَی النَّھَارِ فَاسْتَنَارَ وَعَلَی السَّمٰوٰتِ فَاسْتَقَلَّتْ وَعَلَی الْاَرْضِ فَاسْتَقَرَّتْ وَعَلَی الْجِبَالِ فَرَسَتْ وَعَلَی الْبِحَارِ فَجَرَتْ وَعَلَی الْعُیُوْنِ فَنَبَعَتْ وَعَلَی السَّمٰوٰتِ فَاَمْطَرَتْ۔

اے خدا میں تجھے واسطہ دیتا ہوں اس نام (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا جسے تو نے رات پہ رکھا تو وہ تاریک ہوگئی۔ دن پہ رکھا تو وہ روشن ہوگیا۔ زمین پر رکھا تو اسے قرار آگیا۔ پہاڑوں پہ رکھا تو وہ گڑ گئے۔ سمندروں پہ ڈالا تو وہ بہنے لگے۔ چشموں پہ ڈالا تو وہ پھوٹ پڑے۔ اور آسمان پر ڈالا تو وہ برسنے لگے۔

اور حضرت احمد بن عبداللہ غوثِ وقت نے اپنے مرید کو بالکل صحیح کہا تھا کہ "بیٹا سب سے کم ایمان والا شخص بھی ایمان کو اپنی ذات پر پہاڑ جتنا بلکہ اس سے بھی بڑا دیکھتا ہے۔ زیادہ ایمان والوں کی تو بات ہی چھوڑ دو۔ بعض اوقات ذات اس ایمان کے اٹھانے سے بوجھ محسوس کرتی ہے۔ تو اسے پھینک دینے کا ارادہ کرتی ہے"۔

اس وقت نورِ محمدی اس پر بھکتا ہے۔ اور اسے ایمان کے اٹھانے میں مدد دیتا ہے۔ تو پھر وہ شخص ایمان کی حلاوت اور مزہ محسوس کرتا ہے" (ابریز)

صفاتِ الٰہیہ

ذاتِ باری تعالےٰ کی درج ذیل صفات کا ہمیشہ خیال رکھنا چاہیئے۔ حالتِ ذکر میں ہو خواہ حالتِ فکر میں، خواہ کسی دنیاوی یا انتظامی کام میں مشغول ہو۔ مگر حالتِ ذکر میں اِس کا خیال اگر ضروری ہے

۱۔ جلال ۲۔ جمال ۳۔ کمال ۴۔ نوال

صوفیاء کی اصطلاح میں جمال وجلال سے مراد جمالِ الٰہی وجلالِ الٰہی ہے۔ سچ پوچھیئے تو یہ کائنات حسنِ مطلق کے ظہور کا دوسرا نام ہے۔ شاید اسی وجہ سے صوفیاءؒ کائنات کی ہر چیز کو ملیح کہتے ہیں۔ جن لوگوں نے اس کائنات پر نظرِ غائر کی وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ وجود مع اپنے کمال کے ایک صورتِ حسنہ ہے۔ اور کائنات کی تمام اشیاء اسی کے حسن وجمال کی مختلف صورتیں اِسی کے کمالات کا پرتو ہیں۔ صوفیاء کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اس کائنات میں کسی بری چیز کا وجود سرے سے ہے ہی نہیں۔ ہر چیز اپنی ذات کے لحاظ سے اچھی ہے۔ اس لئے کہ اس کے وجود کا خالق خود اللہ تعالےٰ ہے۔ اور جو ہم کسی چیز پر برے ہونے کا حکم لگاتے ہیں تو وہ صرف اعتباری طور پہ ہوتا ہے۔ نہ کہ ذاتی اور خلقی طور پر، یہ برائی کسی وجہ سے اس چیز پر عارضی ہوتی ہے۔ اور جونہی وہ وجہ دور ہو جاتی ہے، برائی کا عارضی داغ بھی اس سے دھل جاتا ہے۔

محققین کے نزدیک اسماء وصفات کی جمالی وجلالی تقسیم میں اعتبارات کو بڑا دخل ہے۔ اس لئے کہ ہر چیز میں جمال وجلال دونوں کے عنصر موجود ہوتے ہیں گویا ہر اسم بیک وقت بعض اعتبار سے جمالی ہے اور بعض اعتبار سے جلالی۔ یعنی جلال و جمال میں وہی تعلق ہے جو سورج اور شعاع میں۔ جلال و جمال میں فرق صفت میں شدت اور خفت کا نتیجہ ہے۔ یعنی صفت اگر شدت پہ ہے تو جلال اور خفت پر ہے تو

جمال۔ سورج کی قربت اور نزدیکی کو جلال سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جب کہ اس سے نکلی ہوئی شعاعوں کی دوری کو جمال سے۔ بڑی حد تک یہی حال بندے اور اس کے معبود کا بھی ہے۔ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے قریب ہیں وہ ذات حق کے جلالی پہلو کے مشاہدے میں محو ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اللہ کے صفاتی نام "القریب" کے انوار سے سیراب ہونے والا ولی اس کے قربت کے جلالی پہلو کے تحت عمر بھر روتا ہی رہتا ہے۔ جب کہ "المتعالی" کے انوار سے سیراب ہوتے والا ولی اس کے جمالی پہلو کے تحت ساری زندگی ہنستا ہی رہتا ہے۔ یہاں پر ایک نکتہ ضرور سمجھ لینا چاہیئے ۔ کہ جہاں تک جلال الٰہی کا تعلق ہے وہ مختلف موجودات کے ساتھ مختلف رویے سے ظاہر ہے۔ مسلمان اور کافر کے ساتھ جلالی قوتوں کا ایک رویہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ایک عام اور ایک خاص بندے کے ساتھ بھی جلال الٰہی کا ایک جیسا رویہ ممکن نہیں۔ برخلاف اس کے اللہ رب العزت کی رحمت اور جمال جملہ موجودات کے لئے عام ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام "الرحمان" پر رحمانیت اور کرم و مہربانی بحیثیت خالق اپنی ہر مخلوق پہ عام ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ بندہ ہے یا باغی۔ اور یہ جو اللہ تعالیٰ کا قول ہے ۔ "اِنَّ رَحْمَتِیْ سَبَقَتْ غَضَبِیْ" (میری رحمت ۔ غضب پر سبقت لے گئی) اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسمائے جلال جملہ موجودات کے لئے عام نہیں جب کہ اسمائے جمال عام ہیں

طالب حق کو چاہیئے کہ وہ کائنات کا ہر کمال اور اس میں موجودات کی ہر تکمیل و معراج اور عظمت و عروج کو من اللہ سمجھے اور عزت و ذلت، پستی و بلندی، کامیابی و ناکامی اور خوشی و غم کو اسی ذات واحد کی منشا کا نتیجہ سمجھے ۔ کسی بڑے کارنامے کا سہرا کسی مخلوق کے سر نہ باندھے بلکہ اسے اللہ جل جلالہ ہی کا اذن اور حکم تصور کرے ۔ علاوہ ازیں طالب حق سہواً بھی یہ خیال نہ کرے کہ عبادت و ریاضت و بندگی میں اس کی کچھ اہمیت ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ شرک اس کی سرشت میں موجود ہے۔ لہ اور اس

لہ سلسلہ نقشبندیہ میں سب سے پہلے کلمہ نفی اثبات کے ذکر کی مدد سے اس شرک پر کاری ضرب لگائی جاتی ہے۔

کا اپنا خون اس کی ذات کو مٹی کی طرف دھکیلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جو کشش و خوشنمائی دنیا میں دیکھتا ہے۔ دین میں مفقود پاتا ہے۔ پس یہ مالک حقیقی کا انعام ہے اور یوم الست کے فیصلے ہیں کہ وہ خود کو عاجز و گنہگار سمجھنے والوں، مالک حقیقی سے ڈرنے والوں مگر اس کی توصیت سے پر امید رہنے والوں کو ایمان کا پہاڑ اٹھانے کی طاقت و سعادت بخشتا ہے۔ مگر یہ حلاوت و انعام انہی لوگوں کے لئے ہے جو اپنی زندگی کو سرتاپا بندگی کے سوا کچھ نہیں سمجھتے اور اس پر بھی ان کی نظر اپنے نیک اعمال پر نہیں ہوتی۔ بلکہ خالصتاً اللہ سبحانہٗ تعالےٰ کی رحمت اور بخشش پر ہوتی ہے۔

استخارہ

حضرت مخدوم علی ہجویری رحؒ فرماتے ہیں "لفظ استعاذہ، استخارہ اور استعانت ایک ہی مفہوم و مراد کے لئے ہیں۔ یعنی اپنے امور کو اللہ کے سپرد کر کے اس سے نصرت و طاقت طلب کرنا تاکہ وہ ہر قسم کی آفتوں سے محفوظ رکھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ آپ نے ہمیں استخارہ کی اسی طرح تعلیم فرمائی جس طرح قرآن کریم کی۔ چونکہ جب بندہ یہ جانتا ہے کہ ہر کام میں بھلائی اس کی ذاتی محنت و تدبیر سے وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ بندوں کے کاموں کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس میں بھلائی ہے اور کس میں برائی۔ لہٰذا کہ ہر خیر و شر جو بھی بندے کو پہنچے، وہ سب مقدر ہے۔ اور من اللہ ہے۔ لہٰذا بندہ کو اسے مالک کی مرضی سمجھ کر قبول کر لینا چاہیئے۔ استخارہ کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ بندہ اپنے نفس کی شرارت اور اس کی خواہشوں کے فریب سے بچنے کے لئے اللہ کی مدد کو اپنے شامل حال کر لے۔ اور اس سے نصرت و خیر کی توقع رکھے۔ یاد رہے کہ بعض اوقات تو کوئی کسی بات کا بذریعہ خواب واضح اشارہ ہو جاتا ہے۔

اور بعض اوقات اللہ تعالے لیے مطلوبہ سوال کے جواب کو دل میں مضبوطی سے بٹھا دیتے ہیں۔ لہذا خواب میں سوال کا واضح جواب ملنا کوئی ضروری چیز نہیں۔

یوں تو استخارہ کے کئی طریقے ہم تک پہنچے ہیں۔ لیکن یہاں استخارہ کا صرف وہی طریق بیان کیا جائے گا۔ جو حضرات نقشبندیہ میں تعلیم کیا جاتا ہے۔

طریق عشا کی نماز کے بعد تازہ وضو کرکے صدقِ دل سے اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَ اَتُوْبُ اِلَیْہِ ایک سو ایک بار پڑھے۔ اور اپنے تمام اندرونی وظاہری گناہ سے توبہ کرے اور خیال کرے کہ میں پھر سے مسلمان ہوا ہوں اس کے بعد دو رکعتیں نماز استخارہ کی اس نیت سے پڑھے کہ میں خدا سے آرزو کرتا ہوں کہ مرشد کے وسیلہ سے مجھ کو شریعتِ محمدی کا پابند کر دے۔ اور پہلی رکعت میں الحمد کے بعد آیتہ الکرسی اور دوسری رکعت میں الحمد کے بعد قُلْ یٰاَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ خشوع وخضوع سے پڑھے اور بارگاہِ الٰہی میں روئے اور سلام پھیر کے ایک سو ایک بار کلمہ تمجید پڑھ کر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے

جب نیند کا غلبہ ہو تو وہیں زمین پر سو رہے اور اگر کوئی عذر ہو تو جہاں چاہے سو رہے۔ سوتے میں جو کچھ خواب دیکھے مرشد سے بیان کرے اور حالتِ استخارہ میں اپنے دل کی حالت پر غور کرے۔ اگر قلب میں اعتقاد کی وہی مضبوطی ہے تو یہی بشارت ہے۔ (کلیاتِ امدادیہ صفحہ ۴۲)

عقائد ایک مومن کے بنیادی عقائد کیا ہوتے چاہئیں۔ قرآن کریم سے ہی سنیئے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیْدًا ○ (والمحصنٰت پ ۵)

ترجمہ: "اے ایمان والو! یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی ہے اپنے رسول پر اور اس کتاب پر جو نازل کی تھی پہلے اور جو کوئی یقین نہ رکھے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور کتابوں پر اور رسولوں پر اور یوم آخرت پر تو وہ گمراہی میں بڑی دور جا پڑا۔"

قرآن کریم کی ان آیات کی تشریح اس حدیث سے ہو جاتی ہے۔ جو حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس کے راوی حضرت عمر فاروق رضؓ ہیں۔

قرآن کریم میں اور احادیث میں مذکورہ بالا عقائد کے علاوہ بھی کئی دیگر عقائد کا ماننا از بس ضروری ہے۔ مثلاً تقدیر اچھی ہو یا بری دونوں اللہ تعالےٰ ہی کی طرف سے ہیں۔ اور لاریب کوئی اچھائی یا برائی اور نیکی و بدی ایسی نہیں جو اللہ تعالےٰ کے علم اور اندازے سے باہر ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارا یہ بھی عقیدہ ہونا چاہیئے کہ قرآن کریم کے کسی بھی حکم (خواہ امر ہو خواہ نہی) اور اسوۂ محمدیؐ کے کسی بھی خُلق سے جانتے بوجھتے انکار یا استہزا سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ اور اس کے تمام سابقہ نیک اعمال حبط ہو جاتے ہیں اللہ تعالےٰ ہمیں اپنی پناہ میں رکھے!!

ایمان کے درجے

شریعت میں ایمان کے دو انداز دکھائی دیتے ہیں۔ ایک ایمان مجمل، دوسرا ایمان مفصل

ایمان مجمل

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَآئِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ

میں ایمان لایا اللہ تعالےٰ پر جیسا کہ وہ اپنے ناموں اور صفات کے ساتھ ہے۔ اور میں نے اس کے تمام احکام قبول کئے اپنی زبان کے اقرار اور دل کی تصدیق کے ساتھ۔

جس آدمی کی زبان نہیں چلتی، اس کا تقلیدی انکار اور اسکی تقلیدی تصدیق کافی ہے۔ وہ اشارہ سے

عام مومنین کے تابع ہوکر کام کرسکتا ہے۔ اللہ کے یہاں حسن کا یہی ایمان کافی ہے۔ بچوں کا ایمان والدین کے تابع ہے۔ مجنوں، پاگل، مست اور مختل وغیرہ شرعی احکام سے بری ہیں۔ اللہ ان کے معاملے کو بہتر سمجھتا ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ ایمان کا معاملہ زندگی تک ہی ہے۔ مرنے کے بعد ایمان نہیں لایا جاسکتا۔ اور بے ایمان اور کافر و مشرکین کے لئے دعائے مغفرت نہ کرنے کا حکم ہے۔ ایمان اور توبہ کے معاملات اسی دار العمل میں طے ہوسکتے ہیں۔ ہاں مومنین کے اعمال میں صدقۂ جاریہ سے برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ آدمی کے مرنے کے بعد سات چیزوں کا ثواب برابر ملتا رہتا ہے (۱) کسی کو علم پڑھایا گیا ہو۔ (۲) کوئی نہر جاری کردی ہو (۳) کوئی کنواں بنا دیا ہو۔ کوئی درخت لگا دیا گیا ہو۔ (۴) کوئی مسجد بنا دی ہو۔ (۵) قرآن پاک میراث میں چھوڑا ہو۔ (۶) ایسی اولاد چھوڑی ہو۔ جو اس کے لئے دعائے مغفرت کرتی رہے۔

ایمانِ مفصل

اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ ۝

میں ایمان لایا اللہ تعالیٰ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور تقدیر کی برائی بھلائی پر (اور میں ایمان لایا) مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے پر۔

غرض کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ٹھہری اور ایمان کی بنیاد چھ چیزوں پر احسان کی بنیاد ایک چیز پر۔ یہ سب بارہ چیزیں ہوئیں جن کے ساتھ ہر انسان مکلف ہے۔ ان میں سے ایک چیز کو بھی اعتقاداً یا عملاً باوجود امکان و قدرت کے ترک کرے گا یا ان میں سے کسی ایک کا استہزا کرے گا تو دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ نہ مومن رہے گا نہ محسن اس کے سابقہ تمام نیک اعمال غارت ہو جائیں گے اور گناہ جوں کے توں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ

ہمیں ہر بدبختی سے بچائیے!! اور یہ سب آزار غفلت کا ہے اس لئے کہ اللہ اور بندے کے
درمیان غفلت سے زیادہ دبیز اور کوئی حجاب نہیں۔

درویش یہ لفظ "دُر" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں مکاشفات و اشارات الہٰیہ، یہ
مادی بھی ہو سکتے ہیں اور غیر مادی بھی، محسوس بھی ہو سکتے ہیں اور غیر محسوس
بھی اور ان کا کام حقائق و معارف سے مطلع کرنا ہے۔ درویش وہ مردِ مومن ہے جو
حال کے لحاظ سے اپنی خودی میں فنا ہو کر اور مختلف انوارِ الہٰیہ سے سیراب ہونے کے
بعد بقا بالحق کے مقام تک پہنچتا ہے۔ اس وقت اس کی تمام تر توجہ الی اللہ ہوتی ہے
اور یہ کلیتہً مستغنی عن الغیر ہوتا ہے۔

درویش دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک متوجہ الی اللہ ہوتا ہے اور یہ ہر امر میں ثواب
و عذاب، سود و زیاں اور دوزخ و جنت سے بے خبر ہوتا ہے۔ دوسری قسم کا درویش
وہ ہے جو عبادت، ریاضت، مجاہدات، مشاہدات، اور معائنات میں مشغول ہوتا
ہے۔ اور اس کی ایک نگاہ جنت کی نعمتوں پر اور دوسری دوزخ کی آگ پر ہوتی ہے۔
یہ اہلِ خوف سے ہے۔ خوف دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک ہے خوفِ طبعی،
اس کا علاج ہے۔ اتباعِ سُنّت نبویؐ اور دوسرا ہے خوفِ حقانی، اس کا علاج
یہ ہے کہ کلیتہً ذاتِ باری تعالےٰ کی سپردگی میں چلا جائے۔ یہی لوگ اہلِ اللہ اور اولیاء
اللہ کہلاتے ہیں۔ جب کہ اوّل الذکر اہلِ ریاضت کہلاتے ہیں۔ دونوں برحق ہیں۔
ایک کے ساتھ وہبی معاملہ جو حضور ہے۔ اور دوسرے کے ساتھ کسبی معاملہ ہے جو کہ
مسلسل ریاضت کا ثمرہ ہے۔ یاد رہے دونوں کی توفیق من اللہ ہے۔ اور دونوں
محمود ہیں۔ اوّل الذکر عند اللہ شریعت سے تعلق رکھتا ہے۔ جو اہلِ کسب کہلاتے ہیں۔
اور موخر الذکر کا تعلق حقیقت سے ہے۔ یہ اہلِ مشاہدہ اور اہلِ حضور ہوتے ہیں۔ اہلِ
قلب بھی انہیں کو کہا جاتا ہے۔ اہلِ قلب کو تصرف حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ قوت 6

خوشنودیِ الٰہی کا صلہ ہے۔ اہلِ قلب توجہ دے سکتا ہے۔ جب کہ اہلِ شرح کو اللہ رب العزت بیان سے نوازتا ہے؛ اس کا مقام درس و تدریس کے صدقہ جاریہ سے بلند کیا جاتا ہے اور اشاعت و تبلیغِ دین کے صلے میں ان کے مراتب بلند کئے جاتے ہیں۔

لفظ "درویش" کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے اس کے حروف میں جھانکنا بھی ازلیس ضروری ہے۔ اس کا پہلا حرف "د" دلالت کرتا ہے دلائلِ خداوندی پر، نیز "د" اشارہ ہے دل کی طرف اور یہی تو حرف "د" ہے جو دل کو قبضے میں رکھتا ہے۔ اور یہ دل کیا ہے؟ ارادہ ہے، یہ جو گوشت سے بنا ہوا ہے، اصل دل نہیں ہے۔ بلکہ اصل کا مظہر ہے۔ اور یہ جو "د" اشارہ ہے دلیل کی طرف، اس کا معنی ہے راستہ جو عبارت ہے حضور سے، مشاہدہ سے معائنہ سے اور دوامِ حضور سے — اس لفظ درویش میں دوسرا حرف "ر" ہے جس کے معنی ریاضت بمطابق شرعِ محمدیؐ، اور ریاضتِ طریقت اور ریاضتِ حقیقت، احکامِ خداوندی کو ماننا ہے۔ اور علماً اور عملاً ہر دو طریق پر احکامِ خداوندی کی بجا آوری ہے۔ ریاضت سے مراد لایعنی اور فضول باتوں سے بچنا ہے۔ اور ہر اس صحبت سے دور رہنا جو غفلت کا سبب بن سکتی ہے۔ حقیقت کی ریاضت کیا ہے؟ ماسوا سے تعلق توڑ ڈالنا۔ اس لفظ درویش میں تیسرا حرف "و" اشارہ ہے "ورع" کی طرف یعنی طالبِ حق ہر اس چیز سے دست بردار ہو جائے جس سے بالآخر اس کا کوئی مطلب نہیں، اس میں مشتبہ چیزوں سے کنارہ کشی بھی شامل ہے "ی" اشارہ ہے یقین کی طرف۔ حرف "ش" اشارہ ہے شرافت کی طرف۔ اور شرافت تین قسم کی ہے — ایک شریعت کی شرافت جو تسلیم احکامِ خداوندی ہے؛ شوقاً، اخلاقاً، محبتاً اور ایک طریقت کی شرافت ہے، وہ ہے لہو و لعب سے اجتناب

ایک حقیقت کی شرافت ہے اور وہ ہے۔ دوامی توجہ الیٰ اللہ اور یہی حضور ہے۔

فقیر اس لفظ کا پہلا حرف "ف" دلالت کرتا ہے فنا پر کھانے پینے اور پہننے وغیرہ نظام کی جو چیز من اللہ بمقدارِ ضرورت ہے۔ اس پہ صابر رہنا اور اس سے زیادہ کی نہ خواہش کرنا نہ طلب۔ اس لفظ کا دوسرا حرف "ق" اسی قناعت کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس لفظ کا تیسرا حرف "ی" اشارہ ہے "یقین" کی طرف یعنی قرآن وحدیث کی کلی تعلیمات پر یقینِ کامل اور اخلاق سے اس پر عمل پیرا ہونے کی سعی۔ اور "ر" دلالت کرتا ہے ریاضتِ باطنی پر جو غیر اللہ سے اپنی توجہ ہٹانا اپنے ارادہ کو صاف رکھنا اور ظاہر طور پر تعلقاتِ نظامی اور معاملاتِ دنیوی سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتے رہنا اور بقدرِ اشد ضرورت ان معاملات سے برائے نام واسطہ رکھنا۔ سچ پوچھیئے تو فقیر کا دنیا سے واسطہ ہی کیا ہے! فقیر صرف جسماً لوگوں میں دکھائی دیتا ہے لیکن اس کی تمام تر توجہ اپنے خالقِ حقیقی ہی کی طرف ہوتی ہے۔ یہی تو انہماکِ توجہ الی اللہ تھا کہ حضرتِ خضرؑ عامیوں کو کمالاتِ کشف میں حضرت موسیٰؑ سے آگے دکھائی دیئے۔ اسی طرح حضرت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا کھجوروں کے درختوں پر نر کا مادہ پہ اور مادہ کا نر پہ پھول پھینکنا تاکہ وہ پھل زیادہ دیں۔ والی حدیث میں یہ ارشاد فرمانا کہ اچھا آپ لوگ اسی طرح کر لیا کریں جس طرح پہلے کیا کرتے تھے۔ دراصل بعض اوقات صورتِ حال ایسی ہو جاتی تھی کہ سوال وجواب اس صورت میں کیئے جاتے تھے جب ان مقربین خدا کا واسطہ اس دنیا سے برائے نام رہ جاتا تھا اور تمام تر توجہ محبوبِ حقیقی پر جمی ہوتی تھی۔ اور دنیا والوں کے سوال کے جواب میں جو الفاظ ان کی زبان سے نکلتے تھے (نکلتے ہیں) احتمال ایسی باتوں کا ہوتا تھا کہ عامی ان سے شک میں پڑ جائے۔

صالح وہ ہے جس کے اعمال میں شریعت کے خلاف کوئی خدشہ یا کوئی شک نہ ہو۔ وہ ہمیشہ پابندِ شریعت رہتا ہو اور سنتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل در آمد کرتا ہو۔ مخلوقِ خدا اس کی ذات سے کوئی ایذا سرزد ہوتے نہ دیکھے۔ اس حق پرست کی صحبت ایسی ہے جیسے تریاقِ اعظم کہ وہ گناہوں کی سمیت کو بتدریج دور کرتی رہتی ہے، اور اس کے ہم جلیسوں کو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ چاہے وہ فائدہ نیکی اختیار کرنے سے ہو یا برائی چھوڑنے سے۔ اس بزرگ ہستی کے مقام کا اندازہ اس چیز سے لگ سکتا ہے کہ پیغمبروں اور معصومین کے ساتھ دعا کی مقبولیت کے لئے صالحین کا واسطہ اور وسیلہ جائز بھی ہے اور نافع بھی۔

طالح وہ ہے جس کا دارومدار بدی پر، فساد پر، نقصان پر، جھوٹ پر، افراط و تفریط پر، فساد دائمی اور ہر قسم کی دل آزاری پر ہوتا ہے۔ اس کی صحبت ایسی ہے جیسے زہر جو بتدریج سرایت کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہم جلیس کو مکمل طور پر اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔ قرآن و رسول کی تعلیمات اس پر دال ہیں کہ طالح کی صحبت برا اور صالح کی صحبت اچھا بنا دیتی ہے اسلام کے اسی کلیہ کو پیش نظر رکھ کر عارف رومی نے کہا تھا ؎

صحبتِ صالح ترا صالح کند　　　　صحبتِ طالح ترا طالح کند

فاسق وہ ہے جس کے گناہ واضح طور پر زیادہ اور نیکی واضح طور پر کم ہو۔

فاجر جس کے شب و روز گناہوں میں اکثر گذریں مگر کبھی کبھی نیکی کی طرف بھی میلان ہو جاتا ہو۔ لیکن اس میلانِ خیر میں بھی اخلاص موجود نہ ہو۔ وہ اپنے گناہوں پر اتراتا بھی ہو۔ اور اپنے گناہوں ہی کی وجہ سے لوگوں میں مشہور بھی ہو۔

منافق وہ ہے جو ظاہر میں ایمان لاتا ہے مگر باطن میں اس کی تصدیق نہیں کرتا۔ اور دل سے کفر یا شرک کو چاہتا ہے ۔ وہ ظاہر میں مسلمانوں کی دوستی کا دعویدار ہے ۔ اور باطن میں دشمن ۔ اور ایسے شخص پر بھی منافق کا اطلاق ہوتا ہے جس کی زبان شر کو جنم دے ۔ وہ بد خُلق ہو، بد چلن ہو، بد عمل ہو، گویا مسلمان ہونے کا اعلان کرنے کے باوجود اس کے تمام اقوال و افعال قطعی طور پر اسلام کے منافی ہوں ـــــ اس کا مقام درک اسفل ہے ۔ یعنی آگ کی نچلی تہوں میں ۔ یہ کافر سے بھی بدتر ہے ۔ اس لیئے کہ کافر کے مقابلے میں اسلام و مسلمان کو اس کی ذات سے کہیں زیادہ نقصان ہوتا ہے ۔ اسی کو مارِ آستین کہتے ہیں ۔

کافر کافر کا معنی ما خطرہ بِالٰھی اَنّہ لیس کذالک
یعنی کافر وہ ہے جس کے دل میں یہ بات گزر جائے کہ یہ معبود ایسا نہیں ہے جیسے کہ اہل ایمان سمجھتے ہیں ۔ اور یہ کہ ان کے دل میں چھوٹے سے چھوٹے حکم شرعی کے متعلق یہ سوچ گزر جائے کہ فرد کے لئے یا اجتماع کے لئے یہ حکم شرعی مناسب نہیں یا مفید نہیں یا نقصان دہ ہے ۔ بس یہی کافر ہے ۔ کفر کے لفظی معنی ڈھانپنا (حق کو) انکار کرنا دین کی کسی بات کا ۔ نیز کفر سے مراد ہے اللہ اور بندے کے درمیان حجاب غضب حجاب ضلالت اور حجاب قہر ـــــ اور قرآن کریم میں کافر کے متعلق یوں آتا ہے ۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـٴُـھُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ط
اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ع

(ترجمہ) اور جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے دوست طاغوت ہیں جو کہ انہیں نور سے ظلمات کی طرف کھینچتے ہیں، اور وہی ناری ہیں ۔ وہ اس (جہنم) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ۔

ایمان - اسلام - ایقان

ایمان کی تعریف ہے بندے کا خدا کو ماننا جاننا، ایقان کی تعریف ہے مصمم ارادہ تمامی ارادہ اور تمامی نیت بلاشک وشبہ۔

اسلام سے مراد ہے سلامتی کا راستہ، احکام الہٰی کے سامنے گردن جھکانا۔

ایمان کی موہبی چیز ہدایت ہے استعداد ایمان کا اور تکمیل ایمان کا ثمرہ یقین ہے تکمیلِ اسلام کا ثمرہ تکمیلِ سنّت ہے۔ ایمان ذاتِ باری تعالےٰ کا ماننا صفاتِ باری تعالےٰ کو حق جاننا اور اسمائے باری تعالےٰ کی اس طرح تصدیق کرنا جس طرح اس کا حق ہے۔ (مُشَبّہ اور مُعَطّل کی طرح نہیں) افعال میں حق تعالیٰ کو قادر مطلق ماننا۔ اللہ تعالےٰ کو اپنے اختیار میں مختارِ کُل اور ہر قسم کی مجبوری سے معریٰ سمجھنا، نیز اس پر ایمان رکھنا کہ اللہ رب العزت وہی کچھ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں کرتا جیسا یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْد

تکوین کے معنی ہیں کسی بھی چیز کو وجود میں لانا۔ جس کا باعث اَمر ہے۔ تکوین کی کیفیت کسی کو معلوم نہیں، یہ علم امکانی سے باہر ہے اور خاص علمِ الٰہی سے تعلق رکھتی ہے۔ جیسے اللہ تعالےٰ نے نیم کے درخت کو جیسا چاہا ویسا بنا دیا۔ جس طرح گائے کو چاہا اسی طرح سے تخلیق کر دیا۔ اب اگر کوئی کج فہم ہے یہ کہے کہ میں تو اللہ کو اس وقت تسلیم کروں گا جب نیم کے درخت پر سیب لگنے لگیں اور گائے اڑنے لگے۔

ایسا اس لئے نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالےٰ کسی کی مرضی کا تابع نہیں اور کسی کی رضا اس کی رضا پر سبقت نہیں لے جا سکتی۔ دین کا مطلب ہے اساسِ مذہب یہ قانونِ خداوندی ہے، اور دین کا مطلب ہے دستور۔ اور اس دستور کی بنیاد قرآن اور حدیث پر قائم ہے۔ دین کا ثمرہ ہے اعمالِ صالح اور اعمالِ مذمومہ سے

اجتناب یعنی اوامر و نواہی کے مطابق زندگی گزارنا۔

ایک میلان ہے ایک شوق ہے ایک محبت ہے اور ایک عشق۔

میلان میلان کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف طبعی رغبت ہونا۔ لیکن اس کی طلب میں پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ یہی میلان ہے۔

شوق شوق عنوان ہے اس طبعی میلان کا جس کے تحت طالبِ حق اپنے مطلوب کے حصول کی خاطر اس کی طرف کھنچتا ہے، متفکر ہوتا ہے۔ لیکن مایوس ہرگز نہیں ہوتا۔ اس راہ میں اس کی عقلی صلاحیتوں کی گرفت بتدریج ڈھیلی پڑنے لگتی ہے اور وہ اپنے اکثر فیصلے دل کی عدالت میں پیش کرتا ہے۔ اور وجدان سے عدل کا خواستگار ہوتا ہے۔

محبت جو طالب محبت طبعاً چاہتا ہے جس کی دل سے خواہش کرتا ہے جس کے لئے انتھک کوشش کرتا ہے، اور ارادہ محبوب بننے قلب پر ہر لمحہ چھایا رکھتا ہے، وہ بلا کا صابر ہوتا ہے ہرچند جذبات کی مہار اس کے ہاتھ میں ڈھیلی ہوتی ہے لیکن وہ عقلِ سلیم کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا۔

عشق عشق سے طبعی میلان فنا ہوتا ہے۔ طالب کی نظر میں مطلوب ہر وقت بسا ہوتا ہے۔ اس راہ سے واپسی کا کوئی امکان نہیں۔ بس اس راہ پر پڑنا ہی دشوار ہے۔ لیکن پڑ جانے کے بعد کیف ہی کیف ہے۔ اس کی حلاوت کو صرف عشاق ہی جانتے ہیں۔ اس مقام پہ طالب کو حضوری حاصل ہوتی ہے، مطلوب کے بغیر اس کی زندگی حرف بے معنی ہے، طلبِ حسنات مائل نفس ہونا ہے اور عمل حسنات شوق ہے اور فنا فی الحسنات محبت ہے۔ غرق اور مستغرق فی الحسنات عشق ہے، جیسا کہ کثرت ذکر کی علامت یہ ہے کہ ذکر حال بن جائے۔

(جیسے وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ) یہ مقام عشق ہے یہی مقام حضور ہے۔ اور یہی انتہائے حضور ــــ اگر کسی کو موہوبی عشق نہ ہو تو کسبی عشق سے بھی یہ کیفیت کسی حد تک پیدا ہو جاتی ہے۔

اب ایک ہاجشہ ہے، ایک وسوسہ ہے "ایک خطرہ" ہے۔ اور ایک "عزم" ہے۔

ہاجشہ :- وہ ہے جو اول قلب میں پیدا ہو۔ اور پھر اچانک دور بھی ہو جائے۔

وسوسہ :- وہ ہے جو بار بار قلب میں آتا ہے۔ گو اس میں تسلسل تو نہیں ہوتا تاہم وہ مشکل ہی سے نکل پاتا ہے۔ عام طور سے نہیں نکلتا۔

خطرہ :- وہ ہے جو دل میں آتا ہے۔ اور پھر وہیں مقام پکڑ جاتا ہے۔

عزم :- کے معنی ہیں کسی بھی کام کے کرنے کا قصد یا ارادہ کرنا۔

خطرات :- ہیں ایک شیطانی خطرہ ہے، ایک ملکی خطرہ ہے، ایک روحانی خطرہ ہے اور ایک نفسانی خطرہ ہے۔ جو بائیں طرف سے دل پر آتا ہے، اس وقت کچھ گرمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ یہ خطرہ دل میں حسد، شک اور قہر ڈالتا ہے۔

ملکی خطرہ :- وہ ہے جو دائیں طرف سے دل میں آتا ہے۔ نیکی ڈالتا ہے پشیمانی اور عجز کے نقوش اجاگر کرتا ہے۔ اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دل ایک خاص قسم کی ٹھنڈک محسوس کرتا ہے۔ اور گرمی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

نفسانی خطرہ :- دماغ کی سمت سے دل میں آتا ہے تو اس کے اثرات دل پہ تکبر، غرور، قہر، غضب، بڑائی اور انانیت کی صورت میں پڑتے ہیں۔

روحانی خطرہ :- لامکاں سے قلب پر وارد ہوتا ہے، جو سراسر رحمت ہے، شرافت ہے، صبر ہے، احترام ہے اور مقام شکر ہے۔

سالک

منتقل مزاجی سے راہِ حق پہ چلنے والے کو سالک کہتے ہیں۔ یہ دو قسم کا ہوتا ہے ایک تارکِ اسباب۔ جب کہ دوسرا یا اسباب ہے۔

تارکِ اسباب اور تارکِ تدبیر مقام ابدال پر فائز ہے۔ اور اس کے سب اسباب تابع احوال ہیں۔ یہ مقام عام اولیاء کا ہے۔ تدبیر والا گرفتاری میں ہے جو تارکِ تدبیر ہے۔ وہ آزادی میں ہے۔ اور اسباب والا مشکل میں ہے۔ کیوں کہ وہ تدبیر کرتا ہے۔ اسباب تلاش کرتا ہے۔ اس لئے سالک یا تو ابن الوقت ہے یا ابوالوقت۔ ابن الوقت سالک وہ ہے جس پر حال غالب ہو، طبیعت غالب ہو، جو سالک حال پر یا وقت پہ غالب ہو یہ ابوالوقت ہوتا ہے۔ یہ مقام کمال ہے۔ آگے مقام تلوین۔ اور مقام تمکین ہے۔

ایک **تکبّر** ہے۔ ایک تخیل ہے، ایک تکلف ہے — **تکبّر** یہ ہے **کہ انسان** بذریعہ علم، بذریعہ حال، بذریعہ جمال یا بذریعہ کمال اپنے آپ کو دوسرے لوگوں کے مقابلے میں بڑا سمجھے۔ سورۃ اعراف رکوع ۱۷ میں اس طرح آتا ہے۔ سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰيٰتِىَ الَّذِيۡنَ يَتَكَبَّرُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَـقِّ ط

ترجمہ :۔ "میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا۔ جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں۔ جس کا انہیں کوئی حق حاصل نہیں۔"

اسی طرح قرآن کریم میں ایک اور جگہ آتا ہے۔ كَذٰلِكَ يَطۡبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلۡبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ۔ ترجمہ :۔ "اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر مغرور و جابر کے پورے قلب پر مُہر لگا دیتے ہیں۔"

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "تکبر میری چادر ہے۔ اور عظمت میری ازار ہے"۔ جو کوئی شخص ان دونوں چیزوں میں سے کسی میں مجھ سے جھگڑا کرے گا اس کو جہنم میں ڈال دو اور ذرا

پروا نہیں کروں گا۔"

تخیّل

جب کسی کے پاس نہ حال ہو نہ کوئی کمال ہو۔ نہ جلال ہو نہ جمال ہو۔ نہ علم ہو اور نہ ہی قدرت، مگر پھر بھی خود کو اس چیز کا اہل سمجھے۔ جس کا وہ اہل نہیں یہی تخیل ہے۔

تکلّف

جو تکبّر کا اسباب مہیا کرے اور طلب کر کے اپنے آپ کو مُتکبّر بنالے کہ میں ایسے کپڑے پہنوں گا۔ اور ایسے نہیں پہنوں گا۔ ایسا کھاؤں گا اور ایسا نہیں کھاؤں گا اور یہ یہ فیشن کروں گا یہ سب تکلف ہے۔ اور اس کے مکلّف (ایسا کرنے والے) خدا کے مجرم ہیں تکبر و عزور، بڑائی اور عظمت کے لائق صرف ذات باری تعالےٰ ہے۔ کیوں کہ فکر پر، زمان پر، مکان پر اور ہر حال میں اللہ ہی کو کبریائی زیب دیتی ہے۔ کیا انسان کیا جنات، کیا حیوان، کیا حشرات الارض، کیا جمادات کیا نباتات، گویا کائنات کا ایک ایک ذرہ اس بات کا گواہ ہے۔ کہ خالق خالق ہے اور مخلوق مخلوق، مخلوق کبھی بھی خالق کی صفت کو نہیں پہنچ سکتی۔ واقعی وہ اپنی ہر صفت میں احد ہے۔

حصولِ رضاءِ الٰہی کے ذرائع

حصولِ الیٰ اللہ کے چار ذرائع ہیں

۱۔ شریعت ۲۔ طریقت ۳۔ معرفت ۴۔ حقیقت

شریعت

شریعت عبادت ہے۔ دینِ محمدیؐ اور طرز دستورِ نبویؐ، اسی کا نام سنّتِ رسولؐ ہے اور قرآنِ کریم میں اسی شریعتِ محمدیؐ کے افضل و اعلیٰ ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

طریقت

طریقت کے معنی ہیں طریقہ الی اللہ۔ یہ ایک رستہ ہے انسان اور اللہ کے درمیان قلبی تعلق کا۔ اور یہ تعلق ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ کسی بھی منزل

اور مسافر کے درمیان ۔ یہ ایک عام مشاہدے کی بات ہے کہ وہ رستہ جس پر مسافر کا تسلسل اور تواتر سے آنا جانا ہو، وہاں کسی قسم کی ہریالی نہیں ہوتی، بالکل اسی طرح جس مسافر نے اپنے سفر کے لیئے صرف اللہ کی راہ اختیار کی، وہ مباحات کے سوا کسی دوسری چیز کو اس راستے پر نہ پائے گا۔ طریقت اِسی کو کہتے ہیں اور اخلاصِ دوام بھی یہیں سے حاصل ہوتا ہے۔

معرفت ذاتِ باری تعالےٰ کی شناخت صفاتِ خداوندی سے ہوتی ہے۔ جیسا کریم، رحیم، غفار، ستار، ودود وغیرہ ان صفات سے اللہ تعالےٰ کی ذات کے مختلف گوشوں کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ اور ان صفات کے مراقبہ سے دل میں گوناں گوں انوار کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ ہر صفت کا علیحدہ علیحدہ نور اور علیحدہ علیحدہ تجلی ہے۔

حقیقت ظہورِ ذاتِ حق بلا حجاب تعینات ۔ جو عبادت ذاتِ خداوندی سے اور واجب الذات سے اور مالک وخالق کون ومکاں سے اور تمام امور کی ابتدا اللہ پاک کی ذات سے یعنی امر سے ہے۔ سب غیر اللہ کا مقدر فنا ہے۔ اور صرف اللہ سبحانہ تعالےٰ ہی کی وہ ذاتِ اقدس ہے جو تنہا باقی رہے گی جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَّیَبْقٰی ۔ یہی حقیقت ہے تمام مخلوق کی ۔ بلا مثل اور بلا کیف بلا چون اور بلا گون ۔ جو بصارت سے اور عقل کے ادراک سے باہر ہے۔

حَقِیْقَةُ کُلِّ شَیْءٍ هُوَ الْحَقُّ ۔ بندہ جب اللہ تعالےٰ کے اخلاق کو اپنا اوڑھنا، بچھونا اس طور پر بنا لیتا ہے کہ وہ کیفیات کے عالم میں اپنی ذات کو ذاتِ حق میں گم پاتا ہے تو یہی مقام اس کی آگہی حقیقت کا ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام اور اولیائے عظام اس کائنات اور ماورائے کائنات کی کسی بھی چیز کو دنیاوی طریق استدلال سے معلوم کرنا مذموم سمجھتے ہیں۔ وہ دنیا کے علوم کو محدود دنیاوی عقل سمجھ کر اس کی روشنی میں کوئی حکم نہیں لگاتے وہ عام دنیاوی اور ارباب تحقیق کے برعکس معلول سے علّت کی طرف سفر اختیار نہیں کرتے

بلکہ رسولانِ خدا سے اقتباسِ انوارِ قدس کرکے انہیں کی وساطت سے علّت کو اجمالی طور پر معلوم کرکے تفصیل کے لئے معلول سے اپنا سفر شروع کرتے ہیں اور اپنے کشف کی راہ سے حقائق تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ یہی لوگ مردانِ حقیقت ہیں۔

حیات

یعنی اندازِ زندگی و مقدارِ حیات ـــــ زندگی تین روزہ ہے۔ ایک حیاتِ روزِ گزشتہ، دوسری حیاتِ روزِ آئندہ اور تیسری حیاتِ روزِ حال (جس میں کہ وہ زندہ ہے) گزشتہ دن ہاتھ نہیں آتا۔ وہ تو ماضی ہو گیا۔ آئندہ دن کا یقین نہیں کہ اس تک پہنچوں گا بھی یا نہیں یوں عمرِ حیات ایک روزہ رہ گئی۔ مزید غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ حیات تین سانس ہے۔ ایک سانس جو گزر گیا، ایک سانس جو آئندہ لیا جائیگا اور ایک سانس جو ابھی لیا جا رہا ہے گزشتہ سانس ہاتھ سے نکل گیا۔ اور آئندہ سانس کی ضمانت نہیں بس موجودہ سانس ہی حیات ہے۔ ایک لمحہ گزشتہ، ایک لمحہ آئندہ اور ایک لمحہ موجودہ میں سے موجودہ ایک لمحہ ہی زندگی ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ حقیقتِ حیات دو سانسوں کا درمیانی رشتہ ہے۔ پس چاہیئے کہ انسان حیات کے موجودہ وقت کو غنیمت سمجھے ذکر، فکر، اطاعت، عبادت، اخلاص، اخلاق اور ریاضت میں خود کو مشغول رکھے اور اس شغل میں جو چیز بھی رکاوٹ بنتی ہے، اس سے ہمیشہ خبردار رہے۔ ایسا ہوتا اسی وقت ممکن ہے جب قرآن و حدیث کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑا جائے۔ اور اپنی زندگی کو حضرت محمد رسول اللہؐ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق ڈھالا جائے۔ یہی راہِ خیر ہے، اور اسی سے عافیتِ کونین کی توقع وابستہ کی سکتی ہے۔

انسان کی تخلیق

انسان کی تخلیق نطفہ سے ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اور نطفہ کا قرار رحم میں ہوتا ہے اور رحم تین حروف پر مبنی ہے۔ "ر" جس کے بحساب ابجد ۲۰۰ نمبر بنتے ہیں۔ اسی طرح "ح" کے ۸ اور "م" کے ۴۰ گو یا کل ۲۴۸ نمبر ہوئے۔ حکماء نے ان کی تعداد ۳۰۰ بتائی ہے۔ ہر بند

کی علیحدہ علیحدہ روح ہے، علیحدہ ذکر ہے، علیحدہ خاصہ ہے۔ اور علیحدہ فائدہ ہے ہر بند کے مقابلے میں ایک روح ہے اللہ تعالےٰ کی طرف سے روزانہ ۳۰۰ مرتبہ اس پر رحمت ہوتی ہے، خواہ اس روح کے حال کو اس کی خبر ہو یا نہ ہو۔ اور اس کے ساتھ ۳۰۰ محافظ فرشتے ہیں۔ مگر انسان اللہ تعالےٰ کی ان جملہ نعمتوں سے غافل ہے۔ اللہ تعالےٰ اس کی طرف ہر دم ناظر ہے۔ جب کہ انسان ہر دم حق سے فراری ہے۔ انصاف کا تقاضا تو یہ ہے کہ بندہ ربوبیت کا احترام کرے ہر حال میں اور ہر آن اللہ تعالےٰ کی بندگی کرے۔ ذاکر اور فاکر کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ ہر دم متوجہ الی اللہ اور شاکر رہے۔ اسی طرح حق بندگی ادا ہوتا ہے۔ ورنہ وہ لوگوں کی اسی فہرست میں آکر اللہ تعالےٰ کی ناراضگی کا باعث بنے گا۔ جس کے متعلق قرآن کریم میں یوں ارشاد ہے۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ (ترجمہ: بے شک انسان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔)

ریاضت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک نفس کی ریاضت ہے اور ایک روح کی ریاضت ہے۔ ریاضت کے معنی صفائی حاصل کرنا۔ بھوک پیاس برداشت کرنا۔ تکلیف برداشت کرنا۔ ستر پوشی کے لئے معمولی کپڑے پہننا اور نفس کی تمام خواہشوں کو کچل ڈالنا اور تکبر و غرور کے مقابلے میں عجز و انکسار کو اپنا شعار بنانا یہی روح کی ریاضت ہے۔ نفس کی ریاضت یہ ہے کہ طالب حق خود کو پیاس بھوک کا خوگر بنائے۔ اور جب ملے تو برائے نام کھائے، لوگوں سے علیحدہ رہے اور اس کی زندگی کے ہر پہلو میں اسلام ہی اسلام دکھائی دے۔ اسی وقت وہ اللہ کے دوستوں کی صف میں آنے کی توقع رکھ سکتا ہے۔ رہی بات اسلام کے بغیر نفس کی ریاضت کی وہ تو ہندو، جوگی، پادری اور بدھی وغیرہ بھی کرتے ہیں۔ اور انہیں بھی کشف اور خرق عادت جیسی چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ غیر مسلموں کو کشف صرف صفائی نفس اور مشق و مزاولت کے بل پر حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ کشف و خرق عادت، حق

کی برہان نہیں ۔ کشف نہ کوئی معراجِ انسانیت ہے ۔ نہ کوئی قانونِ انسانیت اور نہ ہی یہ لازمۂ ولایت ہے ۔ لوگ اس میں غور و خوض نہیں کرتے ۔ کہ اسے یہ فن ریاضتِ نفس کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اور مسلمان کی ریاضت روح کی ریاضت ہے جب کہ اس کا نام استدراج یعنی درجہ بدرجہ مرحلہ وار تکلف اٹھانا، یاد رہے یہ تکلیف ہمیشہ بقدرِ ظرف ہوا کرتی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے ۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا ۔

(یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں کی تکلیفیں اولیاء اللہ اور اولیاء اللہ کی تکلیفیں عوام برداشت نہیں کر سکتے)

ریاضتِ روح سے مراد ہے اخلاص کے ساتھ عبادتِ الٰہی ۔ کیونکہ کھانے پینے پر قابو کی بات اکل و شرب کی مثال جیسی ہی ہے ۔ اگر کھیت میں پانی ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو فصل بجائے لہلہانے کے خراب ہو جاتی ہے ۔ کم کھانے سے نور پیدا ہوتا ہے ۔ اور زیادہ کھانے سے غفلت پیدا ہوتی ہے ۔ کیوں کہ معدہ دل کے نیچے ہے ، اگر اس میں کھانا زیادہ ہو گا تو بخارات دل کے اوپر اٹھنا شروع ہوں گے دل ان بخارات میں گھر جائے گا ۔ اور نور کو دل تک آنے میں یا تو دقت ہو گی یا اسے راستہ ہی نہ ملے گا ، جب دل پہ نور کی پھوار پڑنی بند ہو جاتی ہے تو قہر اور بغض پیدا ہو جاتے ہیں جو بندے اور اللہ میں دوری کا سبب بنتے ہیں ۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ "کھاؤ پیو مگر اسراف مت کرو" یہاں کھاتے پینے سے مراد ہرگز اتنا کھانا پینا نہیں کہ بندہ غفلت کی لپیٹ میں آجاتے ۔

عبادت کے اقسام

عبادت کو تین اقسام پر تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ ایک قسم کی عبادت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے کی جاتی ہے ۔ یہ عابدین عبادت کا یہ طریق اختیار کرتے ہیں ، اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں پہ اُن کی دہل بٹھا دیتے ہیں ۔ عبادت کا دوسرا انداز محبت کا انداز ہے ۔ یہ مقام اس وقت حاصل ہوتا ہے ۔ جب بندہ اللہ ، رسول ، دین اور شریعت

سے دلی لگاؤ پیدا کر لیتا ہے۔ اللہ تعالےٰ اس نوع کے عابد کو دنیا میں انعام دیتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں میں اس شخص کی محبت ڈال دیتے ہیں۔ عبادت کی تیسری قسم رواجی ہے۔ اس میں اخلاص کو کوئی دخل نہیں بلکہ یہ محض دنیا دکھاوے کی خاطر ہوتی ہے۔ اس عبادت کے پس پردہ نمود و نمائش ہے۔ دینی بھی اور دنیاوی بھی۔ ممکن ہے کہ اس قسم کا ریاکار عابد وقتی طور پر لوگوں کی نظروں میں دھول جھونکنے میں کامیاب ہو جائے لیکن بالآخر ذلت و خواری اس کا مقدر ہوتی ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس نوع کا عابد اپنی رواجی عبادت سے مخلوق کے دلوں میں اللہ کی بجائے اپنی عظمت بٹھانا چاہتا ہے جو غیرت الٰہی کے خلاف ہے اس لئے اللہ رب العزت اس کے جھوٹے کبر و غرور کی پاداش میں سزا کے طور پر اس کو ذلیل کر دیتا ہے۔ دنیاوی ذلت رواجی عبادت کی ادنیٰ سی سزا ہوگی۔ اس ریاکار عابد کے لئے عقبیٰ میں کیا سزا ہے؟ اس کا تصور محال ہے۔ واللہ تعالےٰ اعلم

اقسامِ توحید

توحید کی درج ذیل چند اہم قسمیں ہیں۔

توحید ابراہیمی

اس توحید کی بھی تین مختلف صورتیں ہیں۔

(ا) الہامی (ب) اجتہادی (ج) تحقیقی

توحید الہامی

جب طالبِ حق کے دل میں طلبِ الٰہی کی تڑپ پیدا ہوتی ہے تو یہ توحیدِ الہامی کہلاتی ہے۔

توحید اجتہادی

حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کو دیکھ کر لوگوں سے کہا کہ اچھا یہ خدا ہے؟ جب ستارے چھپ گئے تو فرمایا کہ یہ میرے معبود نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ معبود ہونے کے وہی لائق ہے جو زوال نا آشنا ہے۔ پھر سورج نکل آیا۔ تو کہا کہ اچھا یہ خدا ہے؟ پھر جب سورج

بھی غروب ہو گیا تو فرمایا کہ یہ زوال دیدہ سورج بھی میرا معبود نہیں ہو سکتا۔ پھر چاند نکل آیا تو فرمایا کہ اچھا یہ خدا ہے؟ لیکن جب دن کا اجالا اسے نگل گیا تو حضرت ابراہیم نے اسے بھی معبودیت سے خارج کر دیا۔

توحید تحقیقی

جب ستارے، سورج اور چاند یکے بعد دیگرے زوال آشنا ہوتے چلے گئے تو پھر حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا نہیں، یہ معبود نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ سب فانی ہیں جب کہ معبودِ حقیقی کی شان تو ہمیشہ نہ زوال نا آشنا ہے اور حقیقی معبود تو وہ ہے جس نے زمین و آسمان اور جو کچھ اس میں ہے سب کو پیدا کیا حضرت ابراہیمؑ نے اپنے استدلال سے لوگوں کو یہ سمجھایا کہ جو چیز زوال آشنا ہے، وہ ہرگز معبود نہیں ہو سکتی، معبود کی تو شان ہی یہی ہے کہ وہ کسی کے سامنے عاجز، معذور اور مجبور نہ ہو۔ اور کائنات کی تمام اشیاء اس کے سامنے مجبور محض اور معذورِ مطلق ہوں۔ یہی توحید تحقیقی ہے۔

پھر ایک علمی توحید ہے، ایک عملی توحید ہے، اسی طرح ایک سمعی توحید ہے، ایک تقلیدی توحید ہے اور ایک ذاتی توحید

توحیدِ علمی

توحید علمی یہ ہے کہ عام لوگوں کو پتہ ہے کہ اللہ ہے، گو وہ اسے اس طرح نہیں جانتے جس طرح کہ اسے جاننے کا حق ہے۔

توحیدِ سمعی

اگر کسی شخص کی زندگی میں توحید صرف سمع تک محدود ہے، اور اس نے توحید کو تسلیم کرنے میں صرف کانوں پر ہی اکتفا کیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی شخص کسی گونگے کو اشاروں اشاروں میں اللہ تعالےٰ کے متعلق سمجھائے اور وہ انہیں اشاروں پہ اکتفا کر کے خدا کا تصور ذہن میں بٹھا لے۔ ثواب تو اس کا بھی برحق ہے۔ لیکن اس کو کافی سمجھ لینا محرومی کے مترادف ہے۔

توحید تقلیدی

جو لوگ دوسروں کی توحید کو دیکھ کر محض نقالی کرتے ہیں، وہ بھی ایسے ہی ہیں جنہوں نے تحقیق کے راستے سے توحید کو نہیں دیکھا۔ بلکہ تقلید کے ذریعے اس کو مانا ہے۔ ثواب سے تو یہ ناقلِ توحید بھی خالی نہیں البتہ توحیدِ تحقیقی کا حق ابھی اس کے ذمہ ہے۔

توحیدِ ذاتی

ذاتِ باری تعالیٰ کو بلا کیف، بلا چون اور بلا گون قادرِ مطلق جاننا اور اسی کو معبودِ حقیقی ماننا یہی توحیدِ ذاتی ہے۔

اسی طرح ایک توحیدِ صفاتی ہے، ایک توحیدِ اسماء ہے، ایک توحیدِ افعالی ہے اور ایک توحیدِ آثاری ہے۔

ذات کی رسائی کا دارو مدار صرف توحید تصور پر ہے۔ ذات جوں جوں اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کے انوار سے سیراب ہوتی چلی جاتی ہے، نفس توں توں اس کے ایمان و ایقان میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔

توحید صفات

توحیدِ صفاتِ الٰہی جیسے رحیم، کریم، غفور وغیرہ۔ انسان اس کا احاطہ کرنے پر قادر نہیں لیکن اس کیلئے تگ و دو شرط ہے۔

توحیدِ اسماء

یہ توحید دعوت ہے۔ یعنی یاد کرنا اسماء کا معانی کی پوری پوری آگہی کے ساتھ۔

توحید افعالی

زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ فقط اللہ کا ہے۔ اور یہ سب مرقعے جو کائنات میں پھیلے پڑے ہیں۔ اسی مصورِ اعظم کی قلمکاری کے شاہکار ہیں۔

توحیدِ آثاری

یہ مقامِ عبرت ہے۔ تمام عالم اگر عالمِ عبرت ہے تو مخلوق اس میں ایک کلمہ کا مقام رکھتی ہے۔ اور یہ تمام مخلوقِ الٰہی اس کے مظاہر ہیں۔ بہ چشمِ بینا اس کی تصدیق کرتی ہے۔

پھر توحید الگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اور ایسی توحید حضور اور ذات کا تعلق ، تدبیر اور طریقہ یہ ہے کہ حروف اور صفات سے گزر کر بلا کیف ، بلا عین ، بلا چون ، بلا گون ، از راہ محبت یا از راہِ خوف یا از راہِ امید ذاتِ اقدس پر نگاہ جمائے رکھے۔ تعلق کا ذریعہ لفظی ہے وہ اسمائے حسنہ سے قائم ہوتا ہے۔ جیسے رحیم ، کریم ، غفور وغیرہ صفات ہیں اور تعلق جو عملی ہے افعال سے قائم ہوتا ہے۔ جیسے تمام اوامر و نواہی یعنی اختیارِ الٰہی کے مطابق کچھ کام کرنا اور کچھ نہ کرنا۔ یہ مقام حضور ہے ، مقامِ مشاہدہ ہے۔ مقامِ معائنہ ہے۔

نفس

یہ ایک جسم لطیف ہے جو پورے جسم میں اس طرح سرایت کئے ہوئے ہے۔ جس طرح دودھ میں مکھن۔ حقیقتِ نفس روح سے عنوان ہے حقیقتِ روح خود اللہ سبحانہٗ تعالےٰ ہے۔ اور بلاشبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس کو اللہ رب العزت نے اپنے نفس سے تخلیق کیا۔ پھر ابوالبشر حضرت آدم کے نفس کو نفسِ محمدی کا مماثل کیا۔ علیٰ ہٰذا القیاس جو نفس اختیارِ الٰہی پر بھروسہ کرتا ہے۔ اس کا نفس شعاعِ ربوبیت بنا رہتا ہے اور حق پر کھڑا ہوتا ہے ، شیطان کا ہر حربہ اس کے لئے نقش بر آب ہوتا ہے۔ لیکن نفس جوں ہی اختیارِ الٰہی کو چھوڑ کر اقتضائے طبیعت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ تو شعاعِ ربوبیت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس کی روح تاریکی سے بھر جاتی ہے۔ اور وہ شقی ہو جاتا ہے۔ یاد رہے کہ قرآن و حدیث کے خلاف جو علم بھی بندے کو حاصل ہوتا ہے ، باعثِ شقاوت ہے۔ اور وہ علم و آگہی جو شعاعِ نور کا نتیجہ ہے۔ اور اختیارِ الٰہی پر ایمان و عمل کا ثمرہ ہے ، باعثِ سعادت ہے۔ فرد ہو یا معاشرہ ، اس کے عروج و زوال کا اسی اصول پر مدار ہے۔

روح

یہ ایک مصفّٰی و نورانی جسم لطیف ہے جو بدن میں اس طرح موجود ہے جس طرح دودھ میں مکھن ، قرآن اسے امرِ ربّی کہتا ہے۔ ویسے بھی چونکہ روحِ بشری اپنی اصل اور حقیقت کی بنا پر بجا طور پر روحِ اعظم ہے۔ جو مظہر

ربوبیتِ ذاتِ اقدس ہے، لہذا اس کی کُنہ تک پہنچنا بندہ کے احاطۂ قدرت سے باہر ہے۔

اقسامِ نفس

نفس کے درج ذیل اقسام ہیں۔

(۱) نفسِ امارہ (۲) نفسِ لوّامہ (۳) نفسِ مطمئنہ (۴) نفسِ ملہمہ، (۵) نفسِ کاملہ (۶) نفسِ راضیہ (۷) نفسِ مرضیہ

نفسِ امارہ

نفس کی یہ سرکش قسم ہے۔ یہی وہ نفس ہے جو بندہ کو طبیعتِ عنصری کی طرف دھکیلتا ہے۔ اور عاداتِ سفلی کی طرف راغب کرتا ہے اس کے متعلق سورۂ یوسف میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ (بے شک نفس بُرائی کی ترغیب لانے والا ہے)

نفسِ لوّامہ

خود کو ملامت کرنے والا نفس۔ یہ نفس انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر عالمِ ارواح کے اس معاہدہ کو یاد دلاتا ہے جب اللہ تعالےٰ نے اس سے کہا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟)

اور بندے نے فیصلہ کن الفاظ میں جواباً کہا تھا بلیٰ (کیوں نہیں) یہی وہ نفس ہے جو انسان کو اپنے گناہوں پر شرمسار ہونے کا مشورہ دیتا ہے۔ اور ہر ضلالت و گمراہی پر ملامت کرتا ہے، جیسا کہ سورۂ القیمہ میں آتا ہے۔

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ (اور میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔)

نفسِ مُلہمہ

یہ نفس قدرت کی طرف سے بندے کے دل میں خیر کی رغبت دلاتا ہے۔ اور نیکی کے ثمرات کا یقین دلاتا ہے۔

نفسِ مُطمئنہ

یہ وہ نفس ہے جو ہر کام میں اللہ کے امر کو پیش نظر رکھنے کی رغبت دلاتا ہے۔ اور اسی کے مطابق زندگی کو بخوشی ڈھالنے

ربوبیتِ ذاتِ اقدس ہے، لہذا اس کی کُنہ تک پہنچنا بندہ کے احاطۂ قدرت سے باہر ہے۔

اقسامِ نفس

نفس کے درج ذیل اقسام ہیں۔

(۱) نفسِ امارہ (۲) نفسِ لوّامہ (۳) نفسِ مطمئنہ (۴) نفسِ ملہمہ، (۵) نفسِ کاملہ (۶) نفسِ راضیہ (۷) نفسِ مرضیہ

نفسِ امارہ

نفس کی یہ سرکش قسم ہے۔ یہی وہ نفس ہے جو بندہ کو طبیعتِ عنصری کی طرف دھکیلتا ہے۔ اور عاداتِ سفلی کی طرف راغب کرتا ہے

اس کے متعلق سورۂ یوسف میں اس طرح ارشاد ہوتا ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ (بے شک نفس بُرائی کی ترغیب لانے والا ہے)

نفسِ لَوّامہ

خود کو ملامت کرنے والا نفس۔ یہ نفس انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر عالم ارواح کے اس معاہدہ کو یاد دلاتا ہے جب اللہ تعالے نے اس سے کہا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟)

اور بندے نے فیصلہ کن الفاظ میں جواباً کہا تھا بَلٰی (کیوں نہیں) یہی وہ نفس ہے جو انسان کو اپنے گناہوں پر شرمسار ہونے کا مشورہ دیتا ہے۔ اور ہر ضلالت و گمراہی پر ملامت کرتا ہے، جیسا کہ سورۂ القیمہ میں آتا ہے۔

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ (اور میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنے والے نفس کی۔)

نفسِ مُلہمہ

یہ نفس قدرت کی طرف سے بندے کے دل میں خیر کی رغبت دلاتا ہے۔ اور نیکی کے ثمرات کا یقین دلاتا ہے۔

نفسِ مُطمئنہ

یہ وہ نفس ہے جو ہر کام میں اللہ کے امر کو پیشِ نظر رکھنے کی رغبت دلاتا ہے۔ اور اسی کے مطابق زندگی کو بخوشی ڈھالنے

میرے زمین و آسمان مجھے اپنے اندر نہیں سما سکتے ۔ لیکن میرے متقی بندے کا قلب مجھے اپنے اندر سما لیتا ہے) (اسی لئے مومن کا قلب عرش الہٰی کہلاتا ہے ۔)

عبدیت

عبدیت کے معنی بندہ بننا ۔ اور بندہ اگر اپنے نفس کی خواہش پر خدا بننا چاہے تو یہ اس کی گمراہی ہے ۔ اس طرح نہ وہ نبی بن سکتا ہے نہ فرشتہ اور اگر وہ ایسا بننے کی تگ و دو میں ہے تو سمجھ لو کہ یہ نفس کی بندگی ہے نہ کہ اللہ کی ۔ اسی لئے قرآن اور احادیث میں بارہا نفس کی مخالفت پر زور دیا گیا ہے ۔ اس کی حیلہ سازیوں اور حربوں سے چوکنا رہنے کا مشورہ دیا گیا ہے ۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ " اپنے نفس کو ہوا سے روکو " یاد رکھو کہ جو بھی قانونِ شریعت محمدیؐ میں ناجائز ہے ، وہ ہوا ہے ۔

نیکی کا تعلق روح کے ساتھ ہے ، اور ہوا کا تعلق نفس کے ساتھ ۔ یقین کر لو کہ اہلِ ہوا عند اللہ مغضوب ہے ۔ اور اہلِ روح عند اللہ مقبول ۔ کتاب اللہ اور حدیثِ محمدی اور احکام فقہ وغیرہ نفس کی اصلاح ہی کے لئے آتے ہیں ۔

سوچا جائے تو حیات انسانی نام ہے مسلسل آزمائش کا ، یہ آزمائش ہے جائز و ناجائز میں خطِ تمیز کھینچنے کی اور جائز کو اختیار کرنے کی ، ناجائز سے دستبردار ہونے کی ۔ جائز اعمال کی جزا جنت ہے ۔ اور ناجائز کی سزا دوزخ ، عقلمند وہی ہے ۔ جو ثواب کو حاصل کرنے میں عجلت کرتا ہے ۔ اور عذاب سے دور بھاگتا ہے ۔ جائز اعمال کی درج ذیل چار صورتیں ہیں ۔

(۱) فرض (۲) واجب (۳) سنت (۴) مستحب

اس طرح ناجائز کی بھی درج ذیل چار قسمیں ہیں ۔

(۱) حرام (۲) مفسد (۳) مکروہ (۴) مباح

جان رکھو کہ مومن اور ابتلا ، لازم ملزوم ہیں ۔ قرآن و حدیث سے یہ نتیجہ نکلتا دلد

ہوتا ہے کہ ہر ایمان لانے والا ابتلا اور آزمائش کے لئے تیار رہے۔ ابتلا کی درج ذیل تین صورتیں بنتی ہیں۔

(۱) ابتلائے غضبی (۲) ابتلائے رحمتی (۳) ابتلائے امتحانی

بالفرض کوئی اگر ابتلا کے حصار میں آجائے۔ جیسے مرض، غربت و افلاس اور بے روزگاری وغیرہ اور وہ مبتلا اس پر جزع و فزع اور آہ و زاری کرے اور قدرت کے فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کرے تو یہ ابتلائے غضبی کی علامت ہے۔ اور اگر وہ مبتلا اسی پر صبر کرے اور اسے من اللہ جان کر برداشت کرے تو یہ رحمتِ خداوندی ہے، اور موجب ہے گناہ کی کمی کی اور مغفرت کی۔ اور مبتلا اگر اس پر شاکر رہے۔ تو یہ دلالت ہے ازدیادِ درجات کی تو پھر امتیاز یہ کیا طبعی خفقان (مراد شور و فریاد) اور ایقانی خفقان میں۔

اگر یہ اعتقاد سے ناراضگی کا نتیجہ ہے تو یہ اللہ کا غضب ہے اور اگر طبیعت کی کمزوری یا کسی بیماری کا نتیجہ ہے تو یہ معاف ہے۔ گو یا قصداً کسی صورت میں معاف نہیں ہے۔

اللہ کے نیک بندے وہ ہیں جو بڑی سے بڑی مصیبت پر بھی سائل نہیں ہوتے اور مالک کی رضا میں اپنی خوشی دیکھتے ہیں۔

اب ہمارے پاس یہ تین صورتیں ہیں۔

ایک تو وہ لوگ ہیں جنہیں عوام الناس کہا جاتا ہے مصیبت کے وقت اس کی چیخ و پکار اور واویلا قابلِ معافی ہے۔ تاوقتیکہ اس میں اللہ تعالےٰ سے شکایت کا پہلو نہ ہو۔ لیکن یہی فریاد خواص کے لئے گناہ ہے۔ اور ایک گروہ خاص الخاص کا ہے اس کے لئے یہی فریاد شرک ہے۔ اس لئے کہ اس میں عدم رضا ہے۔

شریعت کے چار دلائل ہیں جس پہ ہر مسلمان کی زندگی کا دار و مدار ہے۔

اوّل دلیل قرآن دوسری دلیل احادیثِ نبوی، تیسری دلیل مسلے کی وضاحت کی

عدم موجودگی میں قرآن و حدیث پر قیاس اور چوتھی دلیل اجماعِ امت۔ جس پہ پوری امت یا امت کے اکثریتی طبقے نے عمل کیا ہے۔ اس کا اجماع ہمارے لیئے، حجت ہے۔ ان چار دلائل کے علاوہ کوئی دلیل حجت نہیں بن سکتی۔ اعمالِ انسانی انہیں احکام کے تحت چلتے ہیں۔ اگر کسی کا عمل ان چار صورتوں سے باہر ہے تو وہ اسلام میں پورا پورا داخل نہیں سمجھا جائے گا۔ تاآنکہ وہ اپنے تمام اعمال کو انہیں سانچوں میں نہ ڈھال لے۔ گویا مسلمانوں کے کاروبارِ حیات کی کامیابی و ناکامی کا تمام تر دارومدار انہیں چار دلائل پہ ہے۔

تقویٰ

تقویٰ کے معنی ہیں ظلم سے بچنا، شریعت پر اس طرح گڑ جانا کہ مشکوک چیز کے نزدیک بھی نہ بھٹکنا۔ اپنی تمام حسیات کو طاہر کرنا، نیز تصور خیال، فکر اور ارادے کو ناجائز سے بچانا، اضطراری طور پہ ایسے خیال کا گزر جانا قابلِ معافی ہے۔ مالک کی رضا کی خاطر اوامر کو اپنانا اور نواہی کو چھوڑنا نہ کہ جنت کے لالچ اور دوزخ کے خوف سے تقویٰ کی درج ذیل تین قسمیں ہیں۔

ایک ادنیٰ تقویٰ ہے۔ اس میں جائز کرنا اور ناجائز کو چھوڑنا ہے۔ ایک اعلیٰ تقویٰ ہے۔ یعنی لایعنی اور غیر مقصود چیزوں کو چھوڑنا۔ ایک غایت تقویٰ ہے۔ جس میں غیر اللہ کے خیال تک کو چھوڑنا شامل ہے۔ اس تقویٰ کے حامل کا ہر سانس یادِ الٰہی میں گزرتا ہے ــــ پہلی قسم کا تقویٰ عوام کا تقویٰ ہے۔ دوسری قسم کا تقویٰ خواص کا تقویٰ ہے۔ اور تیسری قسم کا تقویٰ خاص الخاص کا تقویٰ ہے ــــ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ پہلی قسم کا تقویٰ شریعت کا تقویٰ ہے۔ جو اوامر کا امتثال اور نواہی کا اجتناب ہے۔ اور ایک طریقت کا تقویٰ ہے۔ جو لایعنی اور بے مقصود سے قطعی طور پہ تعلق توڑنا ہے۔ اور ایک حقیقت کا تقویٰ ہے۔ وہ ہے دوام توجہ الی اللہ، بالفاظِ دیگر یہی دوام حضور ہے اور یہی دوام ذکر ہے۔

مرید مرید کے معنی ارادت رکھنے والے کے ہیں۔ اس کی تین قسمیں ہیں۔ ایک کا مقام مراد ہے، ایک کا مقام رد ہے، اور ایک کا مقام مردود فی الطریقت ہے

مراد والا وہ ہے جو اللہ کے قانون کے مطابق عمل کرنے میں خط اٹھائے۔ دل سے پیر کا احترام کرے، اس پر مکمل اعتماد رکھے۔ اور اتباع سنت میں اس سے مسلسل اطلاع احوال کرتا ہے۔ پس اس مقام پر آکر مرید مراد و مقصود کو پہنچتا ہے۔

وہ پہاڑ ہو، اس کا علم عمل کا تابع ہو، تقویٰ اس کا لباس ہو۔ اور شیخ اس میں اپنے پر تو کو دیکھتا ہو۔ مراد کو یوں بھی واضح کیا جا سکتا ہے کہ جب شیخ کسی مرید میں خیر کثیر دیکھتا ہے، اس کی ذات سے فیض کے چشمے کو ابلتے دیکھتا ہے، اور اس کو اپنے سر کا وارث پاتا ہے۔ تو بس وہی خوش بخت پیر کا ایسا مرید ہے۔ جسے اصطلاح میں مراد کہتے ہیں۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ مرید مبتدی ہے اور مراد منتہی۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ طالب حق جو راہ حق میں ریاضت کی مشقیں جھیل رہا ہو، مرید ہے۔ اور جس سے یہ مشقیں اٹھالی گئی ہوں مراد ہے۔ اس ضمن میں حضرت موسیٰؑ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال دی جا سکتی اور دلیل کے طور پر قرآن کریم میں حضرت موسیٰ کا قول "رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ۝"

(اے رب! میرا سینہ کشادہ کر دے۔ اور (میرے لئے) میرا کام آسان کر دے اور میری زبان سے گرہ کھول دے۔) جب کہ نبی امی حضرت محمد مصطفےٰ سے اللہ جل شانہٗ اس طرح مخاطب ہیں۔

"أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ الَّذِي أَنقَضَ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (کیا ہم نے آپ کا سینہ کھول نہیں دیا؟ اور

کیا ہم نے آپ سے وہ بوجھ نہیں اتار دیا۔ جس نے آپ کی کمر توڑ رکھی تھی؟؟ اور کیا ہم نے آپ کا نام بلند نہیں کیا؟ ۔ اسی طرح کی اور بھی کئی مثالیں قرآن کریم میں موجود ہیں۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی باریک بات کہی کہ مرید کو اس کا علم چلاتا ہے۔ جب کہ مراد کی نگہبانی حق سبحانہٗ تعالےٰ کی طرف سے کی جاتی ہے۔ مرید کی مثال پاپیادہ شخص کی ہے۔ ایک بات یاد رہے کہ صوفیائے کرام اور اولیائے عظام نے اس ضمن میں جو جو کلام کیا ہے، وہ اپنے اپنے حال اور مقام کے مطابق ہے۔

مُرتد :- یہ مرید کی وہ شکل ہے۔ جس میں وہ شیخ سے رسمی ارادت رکھتا ہے۔ اور وہ قرآن، حدیث، سنتِ محمدی اور شیخ کے احترام کا حق ادا نہیں کرتا۔

مردودِ فی الطریقت

وہ ہے جو وعدۂ بیعت کرنے کے باوجود قصداً خلافِ شرع جاتا ہے۔ اور یہی نہیں کہ وہ پیر کا احترام نہیں کرتا بلکہ اس کی اہانت تک سے گریز نہیں کرتا۔ معلوم ہونا چاہئیے کہ جس طرح ماں باپ حکم عدولی کی سزا کے طور پر اپنی اولاد کو عاق کر دیتے ہیں۔ ایسا ہی عمل پیر بھی کرتا ہے۔ مگر ان دونوں کے عملوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں مردود بیٹا صرف والدین کی شفقت و محبت اور اعانت و حفاظت سے محروم ہوتا ہے۔ لیکن دوسری صورت میں مردود بالآخر ایمان سے ہی جاتا رہتا ہے۔ کیوں کہ مردود کا عمل صریحاً خلافِ قانونِ خداوندی ہے۔ یعنی جو اللہ فرماتا ہے "وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ قَوْلاً کَرِیْماً" (لوگوں کے ساتھ نرمی سے بات کرو) یہ تو ہوئی عام لوگوں سے گفتگو کی بات اور کجا یہ کہ شیخ سے بے رویہ اختیار کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اپنی پناہ میں رکھے اور کسی بھی مقام پر مردود نہ کرے!!!

اللہ

یہ معبودِ حقیقی کا ذاتی نام ہے اور باقی تمام صفاتی ہیں۔ اللہ کا معنی ہے معبودِ برحق۔ اِلٰہ کا معنی لائقِ بندگی، سزاوارِ عبادت۔ ۔ ۔ اللہ تعالیٰ

ہی کی ذات عبادات، تحیات، صلوٰۃ اور طیبات کی مستحق ہے جیسا کہ الحمدُ للہ سے یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ کرنا نہ کرنا اللہ ہی کی صفت ہے۔ صفاتِ حمیدیہ، صفاتِ جلالیہ، صفاتِ جمالیہ، صفاتِ کمالیہ، صفاتِ نوالیہ کے شایانِ شان صرف ذاتِ خداوندی ہے۔ ان صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ کیونکہ وہ خالق العالمین بھی ہے اور رب العالمین بھی۔ زمین و آسمان اور جو کچھ ان میں ہے۔ سب کی خلقت اور ربوبیت کی شان صرف اللہ کے ساتھ مختص ہے۔

جو دنیا میں ایک دوسرے کے ساتھ معاونت کرتے ہیں، یہ ربوبیت باسباب ہے۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی ایسی چیز سے مدد نہیں کر سکتا جو خالصتاً اس کی اپنی ہو اور وہ اللہ کی ملکیت میں سے نہ ہو۔ حیات، علم، قدرت، مشیت، ارادت، سماع اور بصر، یہ اس کی ذاتی صفات ہیں۔ جو اس کی ننانوے صفات ہیں وہ صفاتِ تکوینی ہیں۔ نظام عالم انہیں اسماء صفات کے تحت چل رہا ہے اور بغیر اذنِ خداوندی ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا کہ لَا تَتَحَرَّكُ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ سے ثابت ہے۔ اگر اندھیری رات میں کوئی کالی چیونٹی کسی کالے پتھر پر چلتی ہو۔ تو یقیناً اللہ اسے دیکھتا بھی ہے۔ اور اس کے پاؤں کی آہٹ کو سنتا بھی ہے۔ اس کے علم اور قدرت سے عالم امکانی میں کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر بھی ہے۔ اور ناظر بھی۔ وہ اپنی ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تخلیق کا حافظ بھی ہے۔ اور ناصر بھی۔ اور اس کائنات میں تنہا اسی کے ہاتھ میں رزق ہے۔ لفظِ رزاق صرف اور صرف اسی کو زیب دیتا ہے۔ جاننا چاہیئے کہ رزق کسی بھی تگ و دو اور محنت و مشقت کا صلہ نہیں، یہ تو فقط اللہ کی رزاقیت کی عنایت ہے۔ قرآن یہی کہتا ہے۔

نسب اللہ اور نسبت اللہ

سورۃ اخلاص اس طرح شروع ہوتی ہے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اے (اے محمدؐ) کہہ دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے۔) پھر اس نسبت کے ثبوت کے طور پر کہا گیا اَللّٰهُ الصَّمَدُ (اللہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں۔) وہ احد ہے۔ لیکن صمد سے ہے۔ نہ کہ احتیاج سے۔ پھر اس کی تاکید توحید ہے۔ وہ لَمْ يَلِدْ ہے (نہ کسی کو جنتا ہے) اس واسطے اَحَد ہے۔ اور چونکہ وہ وَلَمْ يُوْلَدْ (اور نہ وہ کسی سے جنا گیا) بھی اس کی صفت ہے۔ اسی واسطے وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۲ے (اور اس کی برابری کرنے والا کوئی نہیں ہے) ہے۔

اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو پھر اَحَد نہیں ہو سکتا تھا۔ تو گویا اس کی جو پہلی نسبت ہے نسبت تعارف ایک آثار ہے جس پر عالم خلق کی تمام اشیاء دال ہے، جس کا نام ہے عبرت اور ایک تکوین سے ہے کہ کرتے نہ کرنے میں اس کا کوئی ہمراز اور ہم جنس

لے اَحَد اسے کہتے ہیں جسے کسی طور پہ بانٹا نہ جا سکتا ہو۔ اور اس کے علیحدہ علیحدہ اجزا نہ کئے جا سکتے ہوں۔ اب دیکھئے کہ انسان کے لئے واحد کا لفظ تو استعمال ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ مختلف اجزا مثلاً ہاتھ پاؤں آنکھ ناک، کان وغیرہ کے باعث وہ ایک (واحد) کہلاتا ہے۔ لیکن اسے اَحَد نہیں کہا جا سکتا یہ ناقابلِ تقسیم ہونے کی خاصیت اسی ذاتِ باری تعالےٰ کی ہے۔

۲ے بقول بعض علماء کبھی تو شرکت عدد میں ہوتی ہے تو اس کی اَحَد کے لفظ سے نفی فرمائی۔ اور کبھی شرکت مرتبے اور منصب میں ہوتی ہے تو اس کی صَمَد کے لفظ سے نفی فرمائی۔ اور کبھی شرکت نَسَب میں ہوتی ہے تو اس کی لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ سے نفی فرمائی۔ اور کبھی شرکت کام اور تاثیر میں ہوتی ہے تو اس کی وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ سے نفی فرمائی۔

(تفسیر فتح العزیز)

نہیں ہے۔ اور نہ ہی کوئی دوسرا ایسا کر سکتا ہے۔ دوسری نسبت صفات کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تعارف کا مقام ہے۔ تعارف صفات سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کیا معرفت ہے؟ اس کی معرفت پر قرآن کریم کی ان آیات سے روشنی پڑتی ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ یہ تو ہیں اس کی صفات اور لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ یہ ہے اس کی معرفت۔ صفات، مقام معرفت ہے اور اسماء، مقام دعوت اور دعا، تحلیل اور تسبیح اسی سے ہوتی ہے۔ اور اس کے یہی شیونات مقام معرفت ہے۔ شیونات کی دو طرفیں ہیں۔ ایک روحانی طرف ہے جو کیفیت سے باہر ہے۔ اور ایک تفصیلی طرف ہے، وہ ننانوے نام ہیں۔ ان کا اثر ادراک میں آتا ہے۔ شیونات کا تعلق ذات اقدس سے ہے اور ذات اقدس حوادث سے اوّل اور حوادث ہی سے آخر ہے۔

وہ امر جو ہمارے ادراک میں آتا ہے اور جس کی تعبیر ازلی اور ابدی سے ہوتی ہے۔ ازل میں بھی تقدیس ہے اور ابد میں بھی تقدیس ہے۔

سُبْحَانَ کے معنی ہر ممکنہ آلائش سے پاک، وہ بہر طور ان صفات امکانی سے ماوراء ہے۔ جو کسی بھی مخلوق کے احاطہ ادراک میں آ سکتی ہیں۔ جو ننانوے اسماء الٰہی ہیں۔ وہ توصیفی ہیں ان سب کی نسبت اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف ہے، اور یہ سب اسماء حسنہ قرآن کریم میں دعوت معرفت۔ تحمید، تمجید اور دعا کے

لئے آتے ہیں۔

عقائد

نظری عقائد کے بیان کے بعد چاہیئے تو یہ تھا کہ عقلی عقائد پر بھی روشنی ڈالی جاتی۔ لیکن دو وجوہات کی بنا پر اس سے قلم روک لیا گیا۔ پہلی وجہ یہ کہ عبادات کے مختلف پہلوؤں پر گزشتہ صفحات میں ضمناً بہت سی باتیں ہو چکی ہیں۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ کتب فقہ میں عقائد و عبادات کے موضوع پر بہت تفصیل سے ملتا ہے۔ اور کوئی تشنگی باقی نہیں رہتی عقائد کے ضمن میں "عقائدِ نسفی" حضرت مولانا ثناء اللہ پانی پتی صاحب کی کتاب "مالابد منہ" حضرت مولانا ابو محمد عبد الحق محدث دہلوی کی "عقائد الاسلام"۔ مولانا محمد طاہر قاسمی کی "عقائد السلام قاسمی" اور منظوم کتب میں سے محمد نجم الدین رح کی کتاب "قصیدہ بدء الامالی" کفایت کرتی ہیں۔

قربِ حق

دو راستے ہیں جو انسان کے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک راستہ نفس کی طرف جاتا ہے اور دوسرا اللہ کی طرف۔ موخر الذکر راستے میں نفس کے تقاضوں پر نہ چلنا شریعت کے احکام کی پابندی کرنا اور نفس کو ناراض کر کے اللہ کو راضی کرنا شامل ہے۔ جو قرب ہے وہ ارتفاعِ غفلت کا انعام ہے۔ یعنی غفلت کو دور کرنا اور شریعت پر گڑ جانا ہی قرب کی دلیل ہے۔ جو اکتساب ہے یعنی غفلت کے ہر کام پر چلنا اور غفلت کو حاصل کرنا اور غفلت کو مقصود بنا لینا، گویا خدا سے غفلت کو اوڑھنا بچھونا بنا لینا، اللہ سے دوری اور بُعد ہے۔ جاننا چاہیئے کہ غفلت اور قرب آپس میں متضاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرب اور غفلت کبھی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

قرب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر صورت اللہ کو راضی رکھا جائے۔ یہی وہ طریق ہے جس سے نزدیکی حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ رضائے الٰہی تین ذریعوں

سے حاصل ہوتی ہے ۔ شریعت طریقت ، حقیقت ۔ شریعت کا قرب تو یہ ہے کہ تمام احکام الہٰی کو مانا جائے ۔ اور اس کے موافق عمل کیا جائے ۔ طریقت کا قرب یہ ہے کہ لایعنی اور فضول چیزوں سے دور رہا جائے ۔ اور حقیقت کا قرب یہ ہے اللہ تعالےٰ کی ذات میں ہر وقت دھیان رکھا جائے ۔ ماسوا کے خیال کو قطعی طور پر مٹا دیا جائے ۔ ہر حال میں انسان ذکر الہٰی میں مستغرق رہے چاہے بظاہر دنیا کے کاموں میں مشغول ہو ۔

سب سے اعلیٰ قرب یعنی غایت قرب ، اللہ جل شانہٗ کو حاضر و ناظر و قادرِ مطلق سمجھنا ہے ۔ یہی دوامِ حضور ہے ۔ یہی انتہائے سلوک ہے ، اور یہی انتہائے ذکر ہے ۔

قرب دو قسم کا ہے ایک وجوبی قرب ۔ اور دوسرا امکانی قرب ۔ وجوبی قرب اللہ کا ہے ہر چیز کے ساتھ ۔ اور امکانی قرب بندے کا ہے اللہ کے ساتھ ۔ یہ اخلاص اور ریاضت سے حاصل ہوتا ہے ۔ اس میں تمام عبادات شامل ہیں ۔

وجوبی قرب بھی دو قسم کا ہے ایک نفلی ، جس کو قرب نوافل کہتے ہیں ۔ اور ایک وجوبی ہے جس کو قربِ فرائض کہتے ہیں ۔ اللہ پاک کو مخلوق یا اس کی صفات سے معلوم کرنا ۔ یہ نفلی قرب ہے ۔ اور مخلوق کو اللہ پاک کی ذات سے معلوم کرنا یہ فرضی قرب ہے ۔

اخلاص

اخلاص کیا ہے ؟ ایسا عمل جس میں نفس کی شرکت نہ ہو ۔ یہ تین قسم سے ہے ۔ ایک شریعت کا اخلاص ۔ جو احکام خداوندی پر حکم خداوندی کے مطابق عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے ۔ اور خلاف سنت عمل کرنے سے کبھی حاصل نہیں ہوتا ۔ اس نوع کے طالب اخلاص کو

کو چاہیئے کہ وہ ہر معاملہ میں پابندیٔ احکامِ الہٰی کرتا رہے اور شریعتِ محمدی سے ایک
قدم بھی باہر نہ نکالے۔ اور ایک طریقت کا اخلاص ہے۔
کہ عمل کرنے میں، نیت کرنے میں، ادائے فرض میں غیر اللہ پر نگاہ نہ ہو یعنی نیک
عمل بغیر ریا، بغیر عجب اور دکھاوے کے بغیر ہو اور شہرت کا کسی طور شائبہ بھی
پیشِ نظر نہ ہو۔ حقیقت کا اخلاص یہ ہے کہ عمل میں محض رضائے الہٰی ہو۔
ثمرہ عمل بیچ میں سے نکل جائے۔ اور خلاصۂ عمل، کبریائی ذات ہو۔ کیوں کہ جو بھی
چیز زمین و آسمان میں ہے۔ وہ کبریائی ذاتِ اقدس پر دال ہے۔ کائنات کی
ہر چیز تسبیح و ثنا اور عبادت اور ذکر میں مشغول ہے۔ اللہ کی کسی مخلوق میں،
غفلت نہیں خواہ مظہری ہو، خواہ امری ہو، خواہ ذوقی ہو۔ خواہ طبعی ہو، سب
ذاکرین میں سے ہیں۔ مگر افسوس کہ حضرتِ انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو
خلیفۃ اللہ ہونے کے باوجود اپنے مالک سے غافل ہے۔ غالب نے غفلت
کے اس کرب کو اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۔۔۔ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غیر سے طمع

جو لوگ غیر اللہ کی طرف طامع ہیں ان کا ایمان حبط یعنی ضائع
ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالےٰ دلوں کا حال جاننے والا ہے
اور کائنات کی ہر چیز کی حاجت و احتیاج کو جانتا بھی ہے اور پورا بھی کرتا ہے
اور رہی بات ماسوا کی تو وہ بھلا دلوں کی گہرائیوں تک کہاں پہنچ سکتے ہیں۔ مخلوق کو
اپنی پشت کی جانب کا حال بھی معلوم نہیں، حاجت روائی تو بڑی دور کی بات
ہے۔ تو اللہ جیسے آگاہ کو چھوڑ کر ماسوا جیسے اجہل سے توقعات وابستہ کرنا۔ ضیاعِ
ایمانی کے مترادف ہے۔ اور یہی زوالِ ایمانی کا مبدا ہے۔

نور نور کی تعریف یوں کی گئی ہے ظَاھِرٌ لِنَفسِہٖ مُظھِرٌ لِغَیرِہٖ
یعنی اپنے آپ کو بھی ظاہر کرنے والا اور دوسروں کو بھی جیسے بلب جو خود بھی روشن ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی روشن کرتا ہے۔ ہر صفت ہر اسم کا علیحدہ علیحدہ نور ہے۔ اور ہر فعل کا علیحدہ نور ہے۔ جو مبدا ظہور ہے۔ اس نور سے ہر ذرۂ کائنات جلوہ گیں ہے۔ یعنی ظاہر ہے۔ اور اس کی حقیقت صفت نور سے تعلق رکھتی ہے جو صفت باری تعالیٰ ہے۔ اس کا اثر ادراک میں آتا ہے۔ لیکن اس کی حقیقت ادراک سے باہر ہے۔ اس میں تقدیس ہے۔ اور اس کا تعلق امر ربی سے ہے۔ علم امکانی حصولی اور حضوری یہاں پر ختم ہے۔

اس کی چار قسمیں ہیں۔ یعنی جلالی نور، جمالی نور، کمالی نور اور شفعتی نور۔

جلالی نور اس نور کے حامل پر ذکر و فکر کی حالت میں جزع، فزع، وجد، گم گشتگی و وارفتگی کی کیفیات طاری ہوتی رہتی ہیں۔

جمالی نور اس نور کے حامل پر کوئی کیفیت نہیں ہوتی۔ وہ شریعت کے موافق چلتا ہے۔ اور ہمیشہ قال کی حدود میں رہتا ہے۔ اور اس پر کبھی حال غالب نہیں ہوتا۔

کمالی نور اس کا حامل شریعت اور سنّت محمدی پر پہاڑ کی طرح قائم ہوتا ہے۔ اس نور کا مبدا کمالات نبوت ہے۔ یہ خالصتاً شیوۂ پیغمبری ہے۔ اس نور کے حامل کی ترقی بلا تکلف ہوتی ہے۔ خواہ کسب اور ریاضت کم ہو یا زیادہ۔ چونکہ صحابۂ کرام نے اس نور کے حامل سے بلا واسطہ تربیت حاصل کی۔ اور اس نورِ عظیم سے یہ حضرات سیراب ہوئے، اسی لئے کوئی ولی، ابدال، قطب، غوث کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔

شنعتی نور اس نور کے حامل کا حال قلب سے سرایت کر کے بدن پر آجاتا ہے چوں کہ بدن اس نور کو سنبھالنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے جسم پر ایک لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ جسم پر اس لرزے کی کیفیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ کبھی جسم پر حرارت اور تیزی زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور کبھی کم، بعض اوقات جسم کچھ دیر کے لئے سکون بھی ہو جاتا ہے۔ اس نوع کے نور کو استقلال حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی نوعیت اولتی بدلتی رہتی ہے۔ یہ نور زائل ہو کر کوئی اور شکل بھی اختیار کر سکتا ہے۔

ارکان ایمان ان میں تصدیق اور اقرار آتے ہیں۔ یعنی تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان۔ تصدیق میں امر امکانی ہے۔ اور اقرار میں امر تشریعی ہے۔ ان دو ارکان کے ظہور سے مسلمان امن میں چلا جاتا ہے۔ اور اس میں ایک نور پیدا ہو جاتا ہے۔ جو جلتا رہتا ہے اسی سے نیکی و بدی کی تمیز ہوتی ہے اور اسی نور ایمانی کی روشنی میں آدمی نیکی کے راستے پر چلتا ہے۔ اگر یہ نور نہ ہو تو باطل کے اندھیرے نیکی کی اس راہ کے آگے دیوار بن جاتے ہیں۔ اور آدمی کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

یہ نور صفت ہدایت سے ہے۔ خالصتہً وہبی چیز ہے۔ اور کتاب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ایمان کی سات شرائط ہیں، اللہ پر ایمان لایا، ملائکہ پر ایمان لانا۔ آسمانی کتابوں پر ایمان لانا۔ تمام برحق رسولوں پر ایمان لانا، آخرت کے دن پر ایمان لانا اچھی اور بری تقدیر کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے پر ایمان لانا اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر ایمان لانا۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر خیر اور ہر شر من اللہ ہے اسی طرح رزق حلال اور رزق حرام، لیکن انسان کو چاہیئے کہ وہ شریعت کے ظاہر حکم کے مطابق کسب خیر و شر میں اپنا اختیار سمجھے۔ اور احکام خداوندی کی بجا آوری میں

اپنی طرف سے کوتاہی نہ ہونے دے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ کمزور سے کمزور ایمان والا شخص بھی اپنی ذات پر ایمان کو پہاڑ کی طرح بوجھل محسوس کرتا ہے۔ جب اس کی ذات اس بوجھ کو اتار پھینکنے کا قصد کرتی ہے۔ تو اس نازک گھڑی میں حامل کونین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نور عظیم اس پر چمکتا ہے۔ اور اس ناتواں کو ایمان کا بوجھ اٹھانے کی قوت اور حوصلہ عطا کرتا ہے۔ اس بات کو خواص ہی سمجھ سکتے ہیں۔

لیکن ایمان کے لئے تین شرطیں ہیں۔ یعنی :-

ایمان پر شکر ۔ زوال ایمان کا خوف ۔ مخلوقِ خدا پر ظلم سے باز رہنا۔

ایک واجب الوجود ہے، ایک ممکن الوجود ہے اور ایک عدم ہے۔

واجب الوجود واجب الوجود ایسی ہستی کو یا ایسی موجود شے کو کہتے ہیں جس کا وجود واجب یعنی ضروری ہو اور اس کا عدم محال ہو۔ جو واجب الوجود ہوگا۔ وہ ہمیشہ سے ہوگا۔ اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ ابتداء و انتہا سے پاک ہوگا۔ اور کسی وقت بھی اس کی نیستی نہ ہو سکے گی۔ وہ خود بخود موجود ہوگا۔ ہمارے پاس یہ کلیہ بھی ہے کہ جو چیز کسی دوسرے کے پیدا کرنے سے پیدا ہو اور وجود اختیار کرے وہ واجب الوجود نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالٰی سورۂ اخلاص میں خود کہتا ہے کہ نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے۔ اور نہ ہی اس نے کسی کو جنا ہے۔

لاریب واجب الوجود تنہا ذاتِ باری تعالٰی ہے۔ بالفرضِ محال اگر واجب الوجود ذاتِ باری تعالٰی نہ ہو تو کائنات و ماورائے کائنات میں کسی بھی چیز کا وجود ممکن نہ ہو۔ عقلِ سلیم نے باور کرا دیا ہے کہ اللہ ہی بلا شرکتِ غیرے تمام ادنٰی و اعلٰی کا خالق ہے۔ وہ خود کسی سے خلق نہیں ہوا۔ فقط وہی

احد ہے۔ تنہا اس کی ذاتِ اقدس کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ واجب الوجود ہے۔

ممکن الوجود

تمام مخلوق کا کوئی نہ کوئی وجود ہے۔ کبھی یہ ہمارے علم کی پہنچ میں ہوتا ہے اور کبھی پہنچ سے باہر۔ حیات و عدم کے درمیان ممات ہے وجود کبھی زندہ ہوتا ہے کبھی مردہ۔ انسانی مشاہدات اس پر دال ہیں کہ کائنات میں ہر چیز کا وجود عارضی ہے۔ بے ثبات ہے۔ فانی ہے اور اس کا وجود صرف امرِ ربی کے تابع ہے۔ بلاشک اللہ جیسا چاہتا ہے ویسا ہی ہوتا ہے۔ علم خلق کا جو وجود ہے وہ تحت الثریٰ سے لامکاں تک ہے۔ اسے ہی ممکن الوجود کہتے ہیں۔ اس کا تعلق عدم سے ہے، فنا سے ہے اور قیامت تک یہ وجود ایسا ہی رہے گا۔ کونسا وجود؟ انسان کا وجود اور جن کا وجود خواہ کسی صورت سے ہو، عذاب میں یا ثواب میں۔ دنیا جزا کی جگہ نہیں بلکہ دارالعمل ہے۔ یہ ایک کھیتی ہے، جیسا یہاں بویا جائے گا ویسا ہی آخرت میں کاٹا جائے گا۔ جنت و دوزخ کے لئے کوشش صرف جیتے جی کا کھیل ہے۔ ذکر و اذکار، عبادت و بندگی اور اس کی رضا تلاش کرنے کا وقت صرف اسی بے ثبات زندگی تک محدود ہے۔ جب انسان پس دلیوار فنا پہنچ گیا تو اس کے حساب کتاب کے نیچے میزان کی لکیر لگادی جاتی ہے۔ البتہ ان خوش قسمتوں کا معاملہ جدا ہے۔ جو اپنے پیچھے صدقۂ جاریہ چھوڑ جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ جس طرح صدقۂ جاریہ چھوڑنے والوں کے نیک اعمال میں مرنے کے بعد بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح اُن بدبختوں کے برے اعمال میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے جو اپنے پیچھے کوئی ایسا برا عمل چھوڑ جاتے ہیں۔ جس سے مخلوق گمراہ ہو رہی ہو۔ جیسے کوئی سینما گھر، ناچ گھر، شراب خانہ، جوا خانہ وغیرہ۔ اللہ ہر مسلمان کو اپنی پناہ

میں رکھے !!!

عقلِ سلیم کا تقاضا اور بندگی کا حق یہی ہے کہ جب تک انسان دنیا میں رہے اپنے اعمال کو اسوۂ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق بناتے اور رضائے الٰہی کے حصول میں ہمہ وقت لگا رہے ۔ جسے رضائے الٰہی حاصل ہوگئی ۔ اسے بروزِ حشر رحمت الٰہی کی قوی توقع رکھنی چاہیئے ۔

یاد رہے کہ ایک عبارت ہے ، اور ایک معنی ہے ۔ عبارت تمام عالمِ خلق یعنی **تمام مخلوقات** ایک عبارت ہے ۔ اور جس کا معنی ذاتِ باری تعالےٰ ہے ۔ یہ تمام مخلوق مقامِ عبرت ہے ۔ اور خالق مقامِ عبادت ۔ **یعنی** مخلوق سے عبرت پکڑنا ۔ ہر دم اللہ تعالےٰ ہی کی طرف دھیان دینا اور اسی کا تصور کرنا اور مشاہدہ کرنا ۔

مشاہدہ کے معنی ذات سے صفات معلوم کرنا جس کو قربِ فرضی کہتے ہیں اور مخلوق سے خالق کو معلوم کرنا بھی قربِ نفلی ہے ۔ اس طرح دو قرب قرار پائے ۔ ایک قرب نوافل اور دوسرا قربِ فرائض ۔ مخلوق سے خالق کی طرف جانا ، قربِ نفلی ہے اور خالق سے مخلوق کی طرف جانا قربِ فرضی ہے ۔ یہ خالصتاً مشاہدہ ہے ۔ یعنی بلا کیف ایک ذات سے دوسری ذوات معلوم کرنا ۔

مومن کے چار حقوق

ان کے سر کا امن برقرار رکھا جائے گا ۔ یعنی انہیں قتل نہیں کیا جائے گا ۔ ان کے حال کا امن قائم رکھا جائے گا ۔ یعنی نہ انہیں لوٹا جائے گا ۔ اور نہ انہیں غارت کیا جائے گا ۔ ان کے بال بچوں کے لئے بھی امن فراہم کیا جائے گا ۔ ان پر کسی قسم کا ظلم و ستم روا نہیں رکھا جائے گا ۔ ان کی عزت و آبرو محفوظ رکھی جائے گی ۔ اور ان کی عزت و آبرو پر حملہ نہیں کیا جائے گا ۔ مومن کو بغیر عذر قتل نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی بلا وجہ قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار کیا جا سکتا ہے ۔ مومن کو اس کے بال بچوں سے علیحدہ بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ اور نہ ہی اس کا مال جزوی یا کلی طور پر غصب کیا جا سکتا ہے ۔ بادشاہ وقت ہو یا مسلمان رعایا ۔ دونوں پر مومن کے یہ

حقوق مسلم ہیں۔ نیز ان دونوں پر مومن کی ہر قسم کی خیر خواہی لازم ہے۔ اور ہر مسلمان پر یہ ثمرۂ ایمان ہے۔ مومن جو اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے لئے پسند کرے۔

اگر خدانخواستہ کوئی مسلمان مرتد ہو جائے یا کسی دوسرے مسلمان کی عزتِ نفس سے کھیلے اور اس کے احترام کو غارت کرے یا شریعت کی بات سے انکار کرے۔ یا اس کا مذاق اڑائے یا کسی مومن کا مقابلہ کرے۔ اس کے درپئے آزاد ہو یا اس کی زندگی کسی طرح پر بھی اجیرن کرے۔ پہلے تو اس کو نصیحت کرنا چاہیئے۔ اور افہام و تفہیم سے واپس دائرہ اسلام میں لانا چاہیئے۔ اور اگر وہ اپنی خبث اور ظلم پر اڑ گیا ہے۔ تو اسے قتل کیا جائے یا جلاوطن کر دیا جائے۔ تاکہ شعائرِ اسلام کی تضحیک و توہین نہ ہو اور اسلام کا جاہ و جلال قائم و دائم رہے۔ ایسے آدمی یعنی مرتد کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کسی قسم کی دوستی یا کسی قسم کی پاسداری نہ کی جائے اگر وہ شادی شدہ ہے تو ارتداد کے گناہِ عظیم کے بعد اس کا نکاح مومنہ بیوی سے ٹوٹ جائے گا۔ اور وہ اس پر حرام ہو جائے گی۔ تاآنکہ وہ از سرِ نو اسلام سے مشرف ہو اور پھر تجدید نکاح کرے۔ ارتداد کی صورت میں سابقہ نکاح قائم نہیں رہ سکتا۔ مشرق سے لے کر مغرب تک مومن کا ملک ہے۔ وطن ہے، اور مقامِ قبر ہے وہ جہاں چاہے وہاں رہ سکتا ہے اور برائے تحفظ دین و جان اگر ضرورت پڑے تو اس کے لئے ہجرت بھی ضروری ہے۔ اللہ کی زمین مومن پر تنگ نہیں اور جان رکھو کہ جس نے تحفظ دین کی خاطر ملک چھوڑنے کی نیت سے ایک قدم بھی باہر نکالا اور اسی لمحہ اسے موت آگئی تو یقیناً اس کی موت شہادت کی موت ہے۔ اس کے سفر کا ہر قدم عبادت میں شمار ہوتا ہے۔ مومن کے لئے لازم ہے کہ وہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر دنیا کی کسی بھی چیز پہ فریفتہ نہ ہو۔ خدا سے دوستی کرنے کے بعد کسی بھی غیر اللہ کی طرف التفات کرنا خدا کی غیرت کو للکارنا ہے۔ مومن کو جب یہ معلوم بھی ہے کہ بالآخر

اس نے اپنے رب کی طرف لوٹنا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الرُّجْعٰی (پارہ ۳۰) تو پھر اس کی نافرمانی کا کیا جواز؟ لوگ گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ کی بات کرتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ کوئی بھی گناہ گناہ صغیرہ نہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالے کی نافرمانی سب سے بڑا گناہ ہے۔ یہ درست ہے کہ علمائے دین نے گناہوں کی سزاؤں کو ذہن نشین کرانے اور عبرت پکڑنے کی خاطر گناہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ یعنی گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ گناہ صغیرہ کوئی چیز نہیں ہے اس لیے کہ نافرمانی کیسی ہی کیوں نہ ہو، وہ بڑا گناہ ہے۔ شیطان نے بھی تو صرف ایک ہی نافرمانی کی تھی، کہ آدمؑ کو سجدہ نہیں کیا اور راندۂ درگاہ ہو گیا۔ مومن کی نشان یہ ہے کہ اس کی دسترس میں جو کچھ بھی ہے وہ اسے اللہ کی ملک سمجھے اور خود کو اس کا امانتدار اللہ تعالے نے دنیاوی املاک کے خرچ کی راہوں کا بھی تعین کر دیا ہے:

اگر مومن اپنے مال و دولت کو اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق خرچ کرتا ہے تو اس کا مال و دولت اس کے لیے موجبِ رضائے الٰہی ہے اور اگر اس نے اللہ کی عطا کردہ دولت کو صرف اپنے دست و بازو اور دماغ کی کمائی سمجھا اور اس کو شریعت کے اصولوں کی بجائے اپنی مرضی سے خرچ کیا تو یہی دولت اس کے لیے بُعدِ عظیم ہے۔ باعمل مومن زمین کے جن حصوں اور راستوں پر پھرتا ہے یا جس قطعۂ زمین پر رہتا ہے، زمین کے وہ تمام حصّے اس سے خوش ہوتے ہیں اور اپنے لیے اس کے وجود کو اعزاز سمجھتے ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اگر یہ مومن ذاکر ہے تو جس جس جگہ وہ ذکر اللہ کرتا ہے وہ وہ جگہ اس کے ساتھ ذکر کرتی ہے اور اگر یہ مومن فاکر ہے تو زمین و آسمان پر ہر چیز اس کے تابع ہے دنیا کی ہر چیز اس کے لیے معرفت اور وسیلۂ عبادت ہے۔ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ مومن کے لیے فرشتے آسمان میں مغفرت کی

دعا کرتے ہیں اور دنیا کی ہر وہ چیز جس سے اس کا معمولی سا بھی تعلق ہے، اپنی زبانِ حال سے اس کے لیے مغفرت چاہتی ہے۔ ہر وہ راستہ جس پر یہ اللہ کا ذکر کرتے گزرتا ہے، اپنے اوپر فخر کرتا ہے، اس کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے۔ اور دوسرے راستے جو اس ذاکر مومن کے قدموں سے لمس کی سعادت حاصل نہ کر سکے اس رستے پر فخر کرتے ہیں جس کے سینے سے ہوتا ہوا یہ ذاکر مومن گزرا ہے۔ یہ سب درجۂ توحید اور مرتبہ ایمان ہے جس کو بھی اللہ نصیب فرما دے، وہ دونوں جہانوں میں کامیاب ہے۔ جس کے پاس ایمان کی دولت نہیں، اس کا دونوں جہان میں خسارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خسارے سے ہر مسلمان کو اور ہر مومن کو دور رکھے!!! انسان کی خوش بختی اکبر عبادت کی رہینِ منت ہے۔ اکبر عبادت، عنوان ہے ذکرِ الٰہی ہے۔ اور یہی منظورِ قدرت ہے۔ اگر ذاکر اللہ تعالیٰ کو ایک مرتبہ یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے سو مرتبہ یاد کرتا ہے۔ اگر کوئی بندۂ خاص اپنے رب کا ذکر تنہائی میں کرتا ہے تو اللہ بھی اسے تنہائی میں یاد کرتا ہے، اور اگر وہ اپنے رب کا ذکر مجلس میں کرتا ہے تو اللہ تعالےٰ اپنے اس بندے کا ذکر اپنے خاص فرشتوں کی محفل میں کرتا ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ یعنی تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔

انسان اپنی بہترین حکمت و دانائی اور عقلِ سلیم کا ثبوت اسی طور دے سکتا ہے کہ وہ دونوں جہانوں کی کامیابی کی خاطر اپنی زبان اور دل کو ذکرِ الٰہی سے تر رکھے۔ شغلِ ذکرِ الٰہی میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے اور ذکر پر مداومت رکھے۔ یقین کر لو جو شخص اللہ کے نام سے غافل ہے، وہ اللہ کی ذات سے غافل ہے، اور جو اللہ کی ذات سے غافل ہے، وہ اللہ کی نعمتوں سے غافل ہے۔ جس کا ایمان آخرت پر ہے۔ اُسے چاہیئے کہ وہ کثرت سے ذکرِ الٰہی کرے اور آخرت کے درجات حاصل کرے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایات بے پایاں کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ تمام عبادات میں کوئی نہ کوئی شرط

ہے۔ لیکن ذکر اللہ میں کوئی شرط نہیں۔ یہ غیر مشروط عبادت ہے۔ اس میں کسی صورت کی قید نہیں۔ ذکر اللہ مسجد کی پابندی سے بھی بے نیاز ہے۔ اور طہارت کی قیود سے بھی۔ ذکر اللہ میں نہ کپڑوں کا پاک ہونا شرط ہے اور نہ پاک جگہ کا۔

مومن کی مثال شجرِ طیبہ کی سی ہے۔ جیسے درخت کی جڑیں زمین میں ہوتی ہیں لیکن شاخیں آسمان کی طرف چلتی ہیں۔ اسی طرح مومن کی بود و باش ہر چند کہ زمین پہ ہوتی ہے لیکن اس کا تعلقِ قلبی اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور اس کا اعضائی حال شاخوں جیسا ہے۔ یہ عروج کرتا ہے، یہاں تک کہ ترقی کرتے کرتے دربارِ خداوندی تک جا پہنچتا ہے اور اس کے پھل، پتے اور پھول سب آخرت کے لیے ہیں۔ باعمل مومن اس زمین پر عام دنیادار لوگوں کے بیچ رہتا سہتا ہے، مگر اس کے دل کا تار اور تصور کی ڈور آخرت میں بندھی ہوتی ہے۔ اسی واسطے مومن کو شجرِ طیبہ سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ بلاشک یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر مومن کو اپنے ایمان کے درجات، سوغات اور مدارج معلوم ہو جائیں تو یہ دنیا سے اس طور لاتعلق ہو جائے کہ زندہ ہونے ہوتے بھی لوگ اسے مردوں میں شمار کرنے لگیں۔

اللہ کے یہاں مومن کی بڑی قدر ہے اور اس کے بڑے درجات ہیں۔ ایمان کیا ہے؟ یہ ایک نور ہے جو زمین سے لامکاں تک پھیلا ہوا ہے۔ نیز دنیا کے چاروں طرف اس نور کا پھیلاؤ ہے، ملک اور فلک سب اس پہ آفریں ہوتے ہیں اور صاحبِ نور کے لیے مغفرت مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہر مسلمان کو ایمان اور توحید کی حلاوت عطا فرمائے، اور نفس و شیطان کے ہر حربے سے بچائے۔ آمین!!

حقیقت پوچھیئے تو مومن کا ایمان اور توحید لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ختم ہے۔ پھر اس کلمہ طیبہ کے مختلف ثمرات، درجات اور کمالات ہیں اور انعام کے طور پر کرامات، اور جو بھی کوئی نیک عمل کسی مومن سے صادر ہوتا ہے، وہ اسی نیک کلمہ کی

بدولت ہوتا ہے، اور جب مومن سب علائقِ دنیوی اور ناجائز کام سے تائب ہوتا ہے
تو اللہ تعالےٰ اس کے قلب پر خاص قسم کے علوم اور معارف کا دروازہ کھول دیتا ہے۔
پھر وہ ایسی باتیں بیان کرتا ہے جو نہ اس نے کبھی خود ہی پڑھی ہوتی ہیں اور نہ کبھی سنی ہوتی
ہیں اور یہی وہ اخلاصِ کلمہ طیبہ ہے جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور معارف پر آمادہ کرتا
ہے اور جب اس مومن پر ایمانِ الٰہی وارد ہوتا ہے یعنی جب اس پر غلبۂ حال وارد
ہوتا ہے تو اس کی زبان سے ایسے ایسے علوم نکلتے ہیں اور وہ انھیں اس شرح وبسط کے
ساتھ بیان کرتا ہے کہ دنیوی علوم کے ماہر اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

حال ایک موہوبی چیز ہے جو قدرت ہی کی طرف سے دل پر وارد ہوتا ہے، اور
قدرت ہی کی طرف سے رفع ہوتا ہے۔ حال کسی بھی رُخ سے کسبی نہیں ہے۔ مومن کا
ملک مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک پھیلا ہوا ہے جہاں
اس کے لیے امن ہو، وہاں اس کو رہنے کی اجازت ہے۔ جغرافیائی حدود کے لحاظ سے
اس کا کوئی معین ملک نہیں بلکہ پوری دنیا پیدا ہی اس کے لیے کی گئی ہے۔ دُنیا کی ہر
چیز باعمل مومن کے لیے اللہ سے مغفرت مانگتی ہے۔ ان میں جمادات، حیوانات، فرشتے
اور یہاں تک کہ ارواحِ برزخ تک شامل ہیں (برزخ کے دو حصے ہیں۔ ایک حصے کا
نام علیین جو نیک ارواح کا مسکن ہے اور دوسرے حصے کا نام سجین ہے۔ جو ناری
روحوں کا ٹھکانہ ہے۔ علیین کے لیے ملاء اعلیٰ کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے جس کے
معنی ہیں مقربین الٰہی کا مستقر۔ ملاء اعلیٰ جس کو فردوس کہتے ہیں عالمِ حیات اور عالمِ
ممات میں ایک پردہ ہے جسے برزخ کہتے ہیں)۔

مومن کا ایک قدم ابتدائے خلق سے ہے یعنی تحت الثریٰ سے۔ دوسرا قدم
انتہائے عالمِ خلق پر ہے یعنی عرشِ معلیٰ پر۔ ان کی شعاعِ نور و تجلیاتِ نور،
اعمالِ نور، ندائے توحید، ندائے توحیدِ ذاتی، ندائے توحیدِ صفاتی،

اذکارِ اسماء اور عبرتی تکوین فضائے خلق میں پھیلی ہوئی ہے۔ توحید اسی چیز کا نام ہے۔
اور ایمان کا نام توحید ہے۔ اگر تغیر کے ساتھ ہو تو علوم ہوا اور اگر اجمال کے ساتھ ہو تو اعتقاد
ہے۔ بہرحال ثمرۂ کمال شجرۂ جمال ہے۔ مومن کے ایمان کی کمال تجلّی سے تمام فضائے امکانی
روشن ہے اور قلوبِ عارفین اسی نورِ ایمانی سے منوّر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علوم
لدنّیہ سے معمور کیا ہے اور ارکانِ ایمان فضائے امکانی میں جاری و ساری ہیں۔
ایمان یہ بھی ہے کہ جو دلی اقرار و تصدیق سے پیدا اور ہویدا ہو۔ وہ نورِ ہدایت، نورِ عطا
نورِ فضل اور نورِ کرم ہے جس کا مقام سویدا قلب میں بین الخوف اور بین الرجا میں ہے۔
یعنی ڈر اور خوف کے درمیان۔ اس کا کیف نہیں ہے۔ مگر اس کا کیف عمل سے ضرور معلوم
ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ گذشتہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ مومن کے ذکر کا پہلا قدم ابتدائے عالمِ خلق
ہے جسے اصطلاح میں تحت الثریٰ کہتے ہیں۔ اور اس کا آخری قدم عالمِ بالا ہے یعنی علیّین
جہاں ستّر ہزار مقربین فرشتے اللہ کے حضور ہمہ وقت صف باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔
اس طرح کہ ہر فرشتے نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما ہوا ہے اور وہ لَوْ لَا خَلَقْنَا کے
مصداق ہیں، اور یہ فرشتے وجد کے عالم میں اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ معلوم ہونا چاہیئے
کہ صاحبِ مقام اولیائے اللہ نے جب آسمانوں پر فرشتوں کو جھوم جھوم کر اللہ کی حمد و ثنا
کرتے دیکھا تو انھیں ان فرشتوں کی ہیئت اور اندازِ بندگی بہت پسند آیا چنانچہ انھوں
نے اس مقام سے لوٹنے کے بعد بندگی کے اسی طریق کو اپنا لیا۔ مگر افسوس کہ بعد میں
بے مقام لوگوں نے بھی تقلیدی طور پر ایسا ہی شروع کر دیا اور اس کی اصل کو
پہچاننے کی کوشش نہ کی۔

سماع کی ایک شکل سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے یہاں دکھائی
دیتی ہے اس لیے کہ جب وہ وارفتگی کے عالم میں آوازِ جمیل اللہ تعالیٰ کی ثنا کرتے

تھے تو انھیں ایک قسم کا سکون نصیب ہوتا تھا۔ بلاشبہ صوت جمیل صفتِ تجلّی سے ہے۔
یہی وجہ ہے کہ ہمارے سلف صوفیا سماع کو عین عبادت سمجھتے تھے[1] اور ان میں سے بہت
سے حضرات اسی عالم میں اپنے مریدوں کو سلوک کی منازل طے کرایا کرتے تھے۔ لیکن آجکل
یہ وصف شاذ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مومن کے دل میں اس کی استعداد اور طبع کے لحاظ
سے موہوبی طور پر صفتِ جمیل کا ایک نقطہ رکھا ہوا ہے۔ وہ نقطہ جمال چاہتا ہے اور دیکھو
کہ خود اللہ تعالیٰ جمیل بھی ہے اور جمال پسند بھی۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ جمال جو دوسروں
کو اپنی طرف کھینچتا ہے، جمالِ عمل کے علاوہ ہے۔ اور یہ خالصتاً اسی نقطے کا اثر ہے۔
جس کا مسکن دل ہے۔ اس نقطے کو کوئی شخص دیکھ نہیں سکتا۔ وہ مومن کی ایک استعداد
ہے جو آج بھی جاری ہے۔ یاد رہے کہ "حیّ" صوت ہے اور "قیّوم" مادہ ہے۔
مگر یہ نقطہ مادہ نہیں ہے بلکہ استعداد مادہ ہے۔ اسی طرح نطفہ میں بھی ایک استعداد
ہے۔ کیونکہ نطفہ تو تقریباً سب ہی کا ہوتا ہے لیکن سب ہی کی اولاد نہیں ہوتی۔ یہ
ایک نکتہ ہے جو ہمارے علم سے باہر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اس کو جانتے ہیں۔ عملی طور
پر اس کی تفصیل محالات میں سے ہے۔

مومن کے ایمان کے ثمرات، سوغات، اجر، بدل اور عوض وہبی طور پر دارین
میں ملتا ہے۔ قیامت میں تو عذاب سے رہائی کی صورت میں۔ اور دنیا میں اس
لحاظ سے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں مومن کی عزت و احترام ڈال دیتا ہے،
وہ خلق میں باعزت شمار ہوتا ہے اور اپنے ایمان کی بدولت امن میں ہوتا ہے۔
طہارتِ ظاہری، طہارتِ بدنی، عبادتِ ثانی، عبادتِ ، صلہ رحمی،
عقدِ بیع، نکاح، آپس میں اخوت۔ یہ سب ایمان کے ذرائع ہیں، ایمان کی برکات

---

[1]

ہیں۔ ایمان ہی کی بدولت وعظ و وظیفہ اور اعتبار جاری ہے۔ ایوان جنت، حور و غلمان،
فواکہات و طیورِ جنت اور جنت کی دوسری عیش و عشرت اور دیگر نعمت ہائے انواع و اقسام
یہ سب ایمان کا ثمرہ ہے۔ رہی بات دیدارِ الٰہی کی تو وہ جنت کا حاصل ہے، تمام
نعمتوں میں کوئی نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ قیامت کے روز صاحب ایمان ہی اس
سعادت کو حاصل کرے گا۔ دُنیا اور عقبیٰ دونوں کی راحتیں ایمان ہی میں مضمر ہیں۔ اور
رضائے خداوندی کا سبب بھی یہی ایمان ہے۔ اگر ایمان نہ ہوتا تو حق اور باطل میں
تمیز کون کرتا؟ شرک، توحید، فسق اور فجور کی تمیز فقط ایمان ہی سے ہوتی ہے۔ کلمہ طیبہ
لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ایک نورِ معظم ہے جو حق اور باطل کے درمیان خطِ تمیز
کھینچتا ہے۔ ایمان رضائے الٰہی کے حصول کا بنیادی راستہ ہے کفر
سے نجات دلانے والا ایک امن ہے۔ جو بھی اس میں داخل ہوا، وہ مامون ہوا۔
جو مامون ہوا گویا وہ ایک ایسا وقیع موتی بن گیا جس کی قدر صرف اللہ تعالیٰ جیسا
عظیم اور بے مثیل جوہری ہی جان سکتا ہے۔ اور مومن کے ایمان کا صلہ اللہ تعالیٰ کے
سوا دے بھی کون سکتا ہے؟ بے شک اللہ کے یہاں مومن کے مقابلے میں ہر چیز ہیچ
ہے۔ ذکر اذکار، تسبیح، تحلیل، تحمید، تمجید، جلالت، جمالیت، کمالیت، نوالیت
اور عظمت و کبریائی، یہ سب ایمان کے ثمرات ہیں۔ سچ پوچھیے تو ایمان کے بغیر اندھیرا
ہی اندھیرا ہے۔ جمادات، نباتات، حیوانات، درند، چرند، پرند اور حشرات الارض میں
تمیز بھی ایمان ہی کے نور سے ہوتی ہے۔ اگر ایمان نہ ہو تو انسان اور حیوان کے درمیان فرق
مٹ جائے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ سے ایمان کی دولت ملتی ہے۔ اور
اسی کلمہ طیبہ کے طفیل تجدیدِ ایمان کا دروازہ کھلا ہے۔ بعض اوقات آدمی سے غصے
میں، تکلیف میں، غیر متوازن ہونے میں اور ناداستگی وغیرہ میں کفر کے کلمات نکل جاتے
ہیں۔ اس مقام پر صرف اسی کلمے سے ایمان کی تجدید ہو سکتی ہے۔ اللہ کی محبت

ہے کہ آدمی کافرانہ کلمات ادا کرنے کے باوجود، اس کلمہ طیبہ کی مدد سے تجدید ایمان کر سکتا ہے اور اگر کہیں ایسا ہوتا کہ ایک مرتبہ کافرانہ الفاظ نکالنے کے بعد تجدید ایمان کی گنجائش ہی نہ ہوتی تو خدا جانے کتنے لوگ غارت ہو جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کا یہ معمول تھا کہ وہ ذکر کی مجالس کا اہتمام کیا کرتے تھے اور وانشگاف الفاظ میں فرمایا کرتے تھے آؤ بھائیو! ذکر اللہ سے اپنے ایمان کو تازہ کریں۔ قرآن حکیم کہتا ہے کہ جن وانس کی تخلیق صرف اس لیے کی گئی ہے کہ وہ اللہ رب العزت کی خلوص دل سے بندگی کریں۔ اور یہ بندگی ہی کا ثمرہ ہے کہ انسان کو معرفت کی حلاوت نصیب ہوتی ہے۔ لیکن اس عبادت و معرفت کے لیے ایمان خشتِ اوّل ہے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر عبادت و معارف بے معنی الفاظ ہیں۔ یہ اہل ایمان کے لیے بڑی سعادت ہے کہ وہ بذریعہ ایمان و ایقان عبادتِ خداوندی میں ریاضت کرتے ہیں اور اس کی رضا تلاش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اخلاص کے تناسب سے انہیں اپنی معرفت سے نوازتا ہے۔ بے شک سب فرائض سے اعلیٰ عبادت معرفت ہے، اس لئے کہ اگر معرفت نہیں تو عبادت و ثواب سے تو خالی نہیں لیکن کہاں بصارت؟ اور کہاں بصیرت؟

جب تک اللہ کی معرفت حاصل نہیں، بندہ اس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتا۔ ایمان کے بعد معرفت کا ایک بے کنار سمندر موجزن ہے جس میں بندہ اپنی ریاضت اور اللہ رب العزت کے اکرام کی مناسبت سے غواصی کرتا ہے، بلاشبہ عرفان کا حصول، علم توحید کے بغیر ناممکن ہے۔ اسی لیے علم توحید کا حصول ہر مومن کے لیے ازبس ضروری ہے۔ اور توحید کی انتہا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے حوالے سے اس طرح ہمارے سامنے آتی ہے: ہر کلمۂ خیر، اور ہر اچھی چیز مومن کی گمشدہ میراث ہے، جہاں پائے، وہیں اٹھالے، اور جہاں اٹھالی، وہیں اس کی۔ حتمی بات یہی ہے کہ جن کے پاس معرفت نہیں ہے۔ ان کے پاس صحیح ایمان نہیں۔

معرفت فرض عین ہے اور عبادت معرفت کا صلہ، ذریعہ اور ثمرہ ہے۔ معرفت کی تکمیل عبادت سے ہوتی ہے اور عبادت معرفت سے ہوتی ہے۔ معرفت کے حصول کے لیے مسلسل تگ و دو فرض عین ہے۔ معرفت دو قسم کی ہے۔ ایک علمی و برہانی اور دوسری ذوقی اور ارادی ہے جیسے حضرت موسیٰؑ کی معرفت علم شریعت اور دلائل کے ساتھ تھی۔ اور حضرت شعبانؒ کی معرفت ذوق کے ساتھ تھی۔ حضرت شعبان کو اوصافِ خداوندی کا شرعی علم حاصل نہ تھا۔ لیکن ذاتِ خداوندی کے ساتھ ان کا تعلق انتہائی گہرا تھا۔ انھیں شوق الٰہی حاصل تھا اور ان کی معرفت ذوقی تھی۔

قصہ حکایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا گزر ایک بستی سے ہوا۔ وہاں انہوں نے شعبانؒ نامی ایک شخص کو دیکھا جو کہہ رہا تھا کہ اے اللہ! تو کہاں ہے؟ میرے پاس آ کہ میں تیری جوئیں نکالوں۔ اے اللہ! تو کہاں ہے؟ میرے پاس آ کہ میں تیرے پھٹے پرانے کپڑے سیوں۔ اے اللہ! تو کہاں ہے؟ کہ میں تیرے لیے بکری کا دودھ لاؤں۔ اے اللہ! تو کہاں ہے؟ آ کہ میں اپنے ہاتھ سے روٹی پکا کر تجھے کھلاؤں۔ وغیرہ وغیرہ۔ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام نے جب یہ الفاظ سنے تو وہ غلبۂ شریعت کے تحت شعبانؒ پر ناراض ہوئے اور فرمانے لگے یہ تو کیا خرافات بکتا ہے؟ اللہ تو ایسا نہیں ہے جیسا تو نے سمجھ رکھا ہے۔ شعبانؒ نے حضرت موسےٰ علیہ السلام کی باتیں سن کر اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور جنگل کی طرف بھاگ گیا۔ اسی وقت وحی نازل ہوئی اور اللہ کا حکم پہنچا کہ اے موسیٰؑ! یہ تو نے کیا کیا؟ ہم نے تو تجھے اس لیے پیغمبر بنا کر بھیجا تھا کہ تو بندوں کا تعلق ہم سے جوڑے لیکن تو نے تو بندے کا تعلق ہم سے توڑ دیا۔

یہ سنتے ہی حضرت موسیٰؑ شعبانؒ کی تلاش میں جنگل کی طرف گئے۔ قبل اس کے کہ وہ اس عاشق الٰہی تک پہنچتے اور اس سے معذرت کرتے۔ حضرت شعبانؒ جامِ شہادت نوش فرما چکے تھے۔ حضرت شعبانؒ کی یہ ذوقی معرفت تھی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ

ابھی اسلام کی ہوا سے بھی واقف نہیں ہوئے تھے کہ وہ مردِ حق اس وقت بھی اللہ کے حضور سجدہ کیا کرتا تھا۔ یہ خالصتاً ان کی ذوقی معرفت تھی۔

ہر چیز کی معرفتِ ایمانی، فطری ہوتی ہے۔ اور رہی بات انسان اور جن کے ایمان کی تو یہ تحقیقی ہے، توحیدی ہے، توصیفی ہے۔ اور اطاعتی ہے۔ یہ دونوں مخلوقیں مکلف ہیں ایمان پہ احکام پر اور شروطِ ایمان پر۔ اور یہی وہ علم ہے جن کا سیکھنا ان پر فرض کر دیا گیا ہے۔ اسے ہی احکامِ الٰہی، احکامِ قرآنی اور احکامِ توحیدی کہتے ہیں۔ جن اور انسان کے علاوہ باقی تمام مخلوق احکامِ الٰہی اور حدودِ اسلام کی مکلّف نہیں ہے۔ ذکر ادر اسلام مخلوق کا فطری کام ہے لیکن بعض کا اختیاری ہے اور بعض کا غیر اختیاری۔ فرشتوں کا ذکر اختیاری ہے اور باقی کا غیر اختیاری یعنی فطری ہے۔ اس کی پیدائش ہی ذکر پر ہے کیونکہ مخلوق ہے اور مخلوق کا ایک اٹوٹ تعلق ہے۔ مخلوق ہونے کے ناطے اس کی ہر ضرورت اور احتیاج کا تار اپنے خالق سے بندھا ہوا ہے۔ جن و انس کے علاوہ ہمیں دیگر مخلوقِ الٰہی کے ذکر کی آگہی ہو یا نہ ہو لیکن حق یہی ہے کہ یہ اشیاء ذکرِ الٰہی کرتی ہیں کوئی مخلوق ایسی نہیں جس کی تخلیق ذکرِ الٰہی پر دلالت نہ کرتی ہو۔

غفلت اور جہالت کو بیچ میں سے ہٹا کر غور کیا جائے تو بآسانی معلوم ہو جائے گا کہ یہ زمین و آسمان اور ان میں جو کچھ بھی ہے، بغیر خالق کے تخلیق نہیں ہوئے۔ اور مخلوقات میں تقسیمِ رزق کا جو نظام جاری و ساری ہے، از خود کبھی نہیں ہو سکتا۔ عقلِ سلیم اللہ تعالیٰ کے رازق ہونے کی اقراری ہے۔ بلاشک یہ اللہ ہی ہے جو بہر طور بے احتیاج ہے جبکہ ہر مخلوق اس کے سامنے حاجتمند ہے۔ لیکن یہ تمام باتیں توفیق والا ہی سوچ سکتا ہے۔

غفلت کیا ہے؟ بندے کی توجہ کا اللہ کی طرف سے ہٹ جانا۔ معلوم ہونا چاہیے کہ جن و انس کے لیے غفلت اختیاری ہے۔ اور نباتات، جمادات، حیوانات اور حشرات الارض

وغیرہ کا ذکر اذکار اور تسبیح، فطری ہے یعنی ان کا اپنا وجود خالق کی ثنا پر دال ہے۔
اللہ تعالیٰ کی صفتِ حیّ کے طفیل ہی تمام عالم میں زندگی رواں دواں ہے۔ مخلوق کی زندگی ظلّی ہے یعنی عکسی ہے اور ذاتِ اقدس کی زندگی ذاتی ہے۔ وہ ابتدا اور انتہا سے ماورا ہے۔ فنا مخلوق کا مقدر ہے جبکہ بقا اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک ہے، اس کے لیے بقا ہی بقا ہے، جو مقامِ کمال ہے اور مخلوق کی زندگی کے لیے ابتدا بھی ہے انتہا بھی، فنا بھی ہے اور عدم بھی۔ گویا مخلوق، بین الفنا اور بین البقا کے حصار میں ہے۔ کچھ عرصے کے لیے اس پر زندگی وارد ہوتی ہے پھر اس پر قیامت تک کے لیے موت طاری کر دی جاتی ہے۔ مزید برآں مخلوق پر احوال کا تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات پر نہ کوئی حال ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی تغیر و تبدل۔ اسے نہ کوئی حاجت ہے اور نہ کوئی معذوری۔ وہ ضرورت اور احتیاج سے ماورا ہے۔ اور وہ اَحَدٌ ہے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ ہی وہ کسی سے جنا گیا ہے۔ اور یہ کہ نہ اس کا کوئی شریک ہے اور نہ معاون۔ وہ ازلی و ابدی ہے اور ازل کی طرف اور ابد کی طرف جو لوگ نسبت کرتے ہیں، وہ کوئی وقت یا مکان نہیں۔ یہ تو صفات باری تعالیٰ سے ہیں ازلی و ابدی، قائم و دائم، بے ابتدا و بے انتہا کی صفات صرف اسی ربّ العرش الکریم کے ساتھ مختص ہیں۔ اور یہ عالم، ناصر اور حافظ وغیرہ صفاتِ کمالیہ اسی کی ذات کی طرف اشارے ہیں۔
یہی اس کے واجب الذات ہونے کا ثبوت ہے۔ جو لوگ اللہ سبحانہٗ تعالےٰ کے لیے واجب الوجود کی ترکیب استعمال کرتے ہیں، یہ تقدس کے خلاف ہے۔ جو اس لیے بھی مناسب نہیں کہ وجود تو ہر چیز کا ہوتا ہے اوراک، فہم، عقل، خیال اور فکر کی حدود میں آتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کا وجود ہرگز ہرگز ایسا نہیں جیسا کسی بھی ممکنہ مخلوق کا وجود ہے۔ خود حضرت مجدد الف ثانیؒ کا یہی ارشاد ہے

کہ اللہ تعالیٰ کو واجب الذات کہنا مناسب ہے اور واجب الوجود کہنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تقدس کے منافی ہے۔

جہاں تک لفظ ذات کا تعلق ہے اسے اللہ کے لیے استعمال کرنا قطعی جائز ہے۔ خود قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے کہیں وجود کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ البتہ ذات کی طرف اشارہ موجود ہے جیسے هُوَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔ اللہ کی معرفت، عدمِ معرفت ہے۔ اسلئے کہ عقل، فکر اور ادراک محدود ہے۔ جبکہ اللہ رب العزت لا محدود ہے بندہ مثل، چون اور گون کے حصار میں محصور ہے۔ اس کا دماغ کبھی وہ چیز نہیں سوچ سکتا جو اس کائنات سے ماورا ہے۔ اس کے برعکس اللہ رب العزت کا نہ طول ہے، نہ عرض۔ اس کا جسم ہے، نہ جوہر۔ وہ کسی سمت میں ہے اور نہ کسی مکان میں۔ وہ زمان و مکان کے اندر ہے نہ باہر بلکہ زمان و مکان اس کے علم و قدرت میں ہیں اللہ تعالیٰ کا علم و قدرت تمام امکانات پر حاوی ہے۔ اور کائنات و ماورائے کائنات کی ہر ممکنہ چیز کو اس کے علم، محافظت اور ربوبیت نے احاطہ کیا ہوا ہے۔

ربّ کا معنی

پالنے والا۔ بلا اجرت فائدوں کا پہنچانے والا اور مضرتوں کا دور کرنے والا۔ اور یہی ہے شانِ رحمٰن و شانِ رحیم، شانِ رزاق و شانِ عطائے موہوبی اور اس کا کسب کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ تو اس ذاتِ باکمال کی عبادت مناسب بھی ہے اور ضروری بھی۔ کیونکہ وہی صاحبِ جمال بھی ہے صاحبِ جلال بھی۔ اور وہی صاحبِ جلال بھی اور صاحبِ کمال بھی، وہی صاحبِ فضل اور صاحبِ رحمت۔ تمام تر ہدایت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ہر لحاظ سے وحدہٗ لاشریک ہے۔

ممکنات میں جو ایک دوسرے کو فائدہ پہنچتا ہے وہ سب اللہ ہی کے اذن سے پہنچتا ہے۔ اگر اذنِ الٰہی نہ ہو تو فائدے کا کوئی سبب وجود میں نہ آئے اور مخلوق

میں کبھی ایک کو دوسرے سے فائدہ نہ پہنچے ۔ جیسے سردی، گرمی، صحت، علالت، خوشی، غم اور حیات و موت وغیرہ یہ سب اللہ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے ۔ جو مخلوق کو ایک دوسرے سے فائدہ یا نقصان پہنچتا ہے ۔ اس میں خالصتہً اللہ ہی کا ارادہ شامل ہوتا ہے ۔ گویا ایمان کی یہ شان ہے کہ سب اقوال و افعال، حرکات و سکنات، فہم و ادراک، مِنَ اللہ ہے ۔ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اللہ ہی کے حکم کے تحت ہو رہا ہے ۔ وہ خود کہتا ہے کہ ہماری منشا کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت کی قدرت نہیں رکھتا ۔ یہ حیات و موت، خوشی و غم، بیماری و صحت، نفع و نقصان، شاہی و فقیری، قدرت و معذوری، آزادی و غلامی، کامیابی و ناکامی، سب مشیتِ خداوندی پر موقوف ہے ۔

کمالاتِ ایمان

کمالاتِ ایمان میں ۔ سرِ فہرست رضائے الٰہی حاصل کرنا ہے ۔ اس لیے کہ یہی نعمتِ کبریٰ ہے ۔ قرآن کریم کی یہ آیت اس پر دال ہے : رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۔ بلاشک ذکر اللہ کبیر نعمتوں میں سے ہے ۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ ایک عظیم چیز کی بدولت دوسری عظیم چیز حاصل ہوتی ہے ۔ یعنی ذکر اللہ کی خدمت سے رضائے الٰہی اور رضائے الٰہی سے انعام کے طور پر حلاوتِ اطاعت حاصل ہوتی ہے ۔ جیساکہ پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ ذکر اللہ اپنی جگہ اکبر ہے اور رضائے الٰہی اپنی جگہ اکبر ہے ۔ اور یہ نعمتِ کبریٰ ذکر کی بدولت حاصل ہوتی ہے دنیا میں قلبی سکون اور جنّت میں حور و قصور اور دیگر انواع و اقسام کی نعمتیں، اخلاصِ ایمان ہی کے ثمرات ہیں ۔ اس کے مقابلے میں دنیا میں قلبی بے سکونی اور جہنم کی ناقابلِ بیان کربناکیاں، بے ایمانی کی خدائی سزائیں ہیں ۔ موت قیامتِ صغریٰ ہے ۔ اور بے ایمان کے لیے موت کے بعد اس کی قبر (بمقام برزخ) میں دوزخ کی طرف ایک کھڑکی کھول دی جاتی ہے ۔ گویا ایک طرح سے اس بے ایمان کو قیامت کی کربناکیوں سے مرنے ہی دوچار کر دیا جاتا ہے ۔ جبکہ صاحبِ ایمان کی قبر میں جنّت کی طرف ایک کھڑکی

کھول دی جاتی ہے۔ گویا ایک طرح سے صاحبِ ایمان کو مرتے ہی جنّت کی راحتوں سے ہمکنار کر دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنی رحمت اور سلوک خاص سے قبر کی آسودگی عنایت فرمائے۔ آمین !!!

یہ بات اپنی جگہ قطعی طور پر درست ہے کہ ایمان کی دولت بھی اسی معطی کی عطا ہے، وہ جسے چاہے ،' ہدایت اور ایمان عطا فرمادے، اور جس سے چاہے، اُس سے یہ دولتِ ایمان چھین لے، جسے چاہے اسے ایمان کی طرف آنے ہی نہ دے۔ اللہ اپنی پناہ میں رکھے!! لیکن مشاہدہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ غفورِ اعظم ہدایت اور نورِ ایمان دینا اسی کو ہے جو اس کی دل سے خواہش کرتا ہے۔ ہدایت اور نورِ ایمان سے منہ موڑنے والے کو وہ یہ نعمتِ غیر مترقبہ اس لیے عنایت نہیں کرتا کہ یہ اس کی غیرت کے خلاف ہے۔

بحمد اللہ مسلمانوں کے یہاں بچے کی پیدائش کے بعد، اس کے کان میں ایمان اور توحید کا اعلان ہوتا ہے۔ یعنی اذان اور اقامت کہی جاتی ہے، پھر جب وہ سنِ شعور کو پہنچتا ہے تو اس پر احکامِ ایمان" توحیدِ ایمان" کلمہ طیبہ کا اقرار اور دینِ محمدی کے پانچ ارکان کا جاننا لازمی قرار پاتا ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک علمی اور دوسری عملی۔ بالفاظ دیگر علمی اور عملی دونوں پہلو لازم و ملزوم ہیں۔ بندے کو چاہیئے کہ وہ اقرار باللسان بھی کرے اور عمل بھی کرے۔ احکامِ خداوندی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ واجبی علم رکھنے والا مسلمان بھی جانتا ہے کہ کلمہ، روزہ، نماز، زکوٰۃ اور حج، ارکان اسلام ہیں، اور ان پانچ ستونوں میں سے ایک کا گرنا بھی پوری عمارت کے گرنے کے مترادف ہے۔ مومن کے لیے یہی شروطِ حیات ہیں، اور موت کے وقت پھر ایمان کا نازک ترین مرحلہ ہے۔ اس مرحلے پر جس کے لبوں پر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ آ گیا، اس کے لیے ان شاء اللہ عقبیٰ میں راحتیں ہی راحتیں ہیں۔ گویا ایمان کے ساتھ دنیا میں رہنا اور ایمان کے ساتھ

دُنیا سے جانا۔ عقبیٰ کا بندوبست ہے۔ دوسرے لفظوں میں عقبیٰ کی سزا و جزا کا دار و مدار اسی بے ثبات دُنیا کی زندگی پر موقوف ہے۔ اس دار العمل میں جس نے اسوۂ رسول محمدیؐ کے سانچے میں اپنی زندگی کو ڈھالا، اس کے لیے دارین میں خیر ہی خیر ہے، اور جس محروم نے اسوۂ رسول محمدیؐ سے روگردانی کی، عذاب دارین اس کا مقدر ہے۔

الحمدللہ کہ ایمان مبداء رضائے الٰہی بھی ہے اور انتہائے اعمال انسانی بھی۔ ذاتِ خداوندی جس کا بدل اور مثل کوئی نہیں، بندے کو اس وقت تک ایمان کی دولت سے نہیں نوازتا جب تک کہ اس سے راضی نہ ہو جائے اور اس رضا کی تکمیل اس وقت ہوگی جب بروزِ حشر انعامِ عظیم کے طور پر وہ مومنوں کو اپنا جلوہ دکھائے گا۔ غیر مومن کی بد قسمتی کا اندازہ لگاؤ کہ وہ تیرہ بخت بروزِ حشر اپنے خالق کے دیدار سے محروم رہے گا۔ جلوۂ خداوندی، جس کی خواہشیں دل میں لیے پیغمبر چل بسے، دیکھ کر ہر مومن دنیا و عقبیٰ کی تمام نعمتیں بھول جائے گا۔ اور اس پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگی جسے الفاظ بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ مومن کے لیے یہ جلوۂ الٰہی ممکنہ سعادتوں میں سے اعظم سعادت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتِ خاص سے ہر مسلمان بھائی کو یہ بے مثیل سعادت عطا فرمائے اور ہم سب کو اس راستے پر دوام عطا فرمائے جس کا انعام رضائے الٰہی ہے۔ آمین!!

قرآن کے دو پہلو ہیں، ایک قرآن کی عبارت ہے، دوسرا اس کا معنی و مفہوم۔ قرآن کی عبارت کی تلاوت سے ایمان میں تازگی آتی ہے اور قرآن کے مفہوم و معنی پر غور و خوض کرنے سے ایمان کی قوتِ عمل میں تیزی اور تنوع پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ ایمان ہی ہے جس کی بدولت ذاتِ خداوندی تک رسائی ہوتی ہے۔

احکامِ الٰہی کا ایک عملی پہلو ہے اور دوسرا علمی۔ احکامِ الٰہی معلوم ہونے کے باوجود جو شخص ان پر عمل نہیں کرتا۔ وہ دوسرے لفظوں میں احکامِ الٰہی سے مایوس ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ مومن کا کام ہے کہ قرآن کے ظاہر پر بھی غور

کرے اور باطن پر بھی۔ اور اپنے تدبر، فکر اور ہوش کی پوری پوری صلاحیتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس پر دھیان جمائے رکھے، ہمیشہ اللہ کی طرف مائل اور متوجہ رہے وہ جو بھی کام کرے اللہ ہی کی رضا کے لیے کرے، اور جس کام سے رُکے اُسی کی رضا کے لیے رُکے۔ اسی کا معنی حضور ہے اور اسی کو شہود کہتے ہیں، اسی سے کمالِ ایمان حاصل ہوتا ہے اور تکمیلِ حضوری اس کے بغیر ممکن نہیں، قرآن کے احکام پر فکر نہ کرنا اور اسے قولاً یا فعلاً شعارِ حیات نہ بنانا، زوالِ ایمان کو دعوت دینا ہے۔ اور دارین کا خسارہ ہے، اس کا تمام تر دارو مدار سنتِ نبویؐ پر ہے۔ جو عمل ہی عمل ہے۔ جس آدمی نے سنتِ نبویؐ کو جتنی مضبوطی سے پکڑا اور جتنی مستعدی سے اس کے مطابق زندگی گزاری، اس نے اسی نسبت سے قربِ الٰہی کا راستہ طے کیا، اور اسی نسبت سے وہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت اللعالمین کے انوار سے سیراب ہوا۔ اسی انوارِ رحمت کے ذریعے مومن کے درجات، کمالات اور ایمان بڑھتا ہے اور رضائے الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ جہاں بندہ سنتِ نبویؐ سے ایک بال بھی ہٹا، اس کا ایمان زوال کی لپیٹ میں آگیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو زوالِ ایمان سے بچائے۔ آمین!! دین کی تکمیل اطاعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے اور اطاعتِ رسول خالصتہً اطاعت اللہ ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ قرآن ہی میں ایک اور جگہ اس طرح ارشاد ہوتا ہے: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ اتباعِ سنت ہی میں مقامِ عبدیت ہے، اور یہ صرف رضائے خداوندی سے ملتی ہے۔ یہ کمالاتِ نبوت اور اخلاصِ ایمان ہے کہ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا اور اللہ کی اطاعت کی جیسا کہ اس کا حق ہے، وہی محبوبِ خدا ہے، اللہ کی محبوبیت میں آجانا، معمولی مقام نہیں۔ اس کی بلندی کو صرف بینا

لوگ ہی جانتے ہیں۔ اس مقامِ محبوبیت کا راستہ عین سنّتِ رسول ہے۔ آج تک دنیا کے ادنیٰ ولی سے لے کر اعلیٰ ولی تک ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ وہ شریعت کے خلاف راستہ اختیار کر کے سلوکِ حقیقت کی دہلیز تک پہنچ گیا ہو۔

یاد رہے کہ ایمان کی دولت اور ثمرات سے محروم رہنا ذریعہ جہنم ہے۔ جو لوگ قولاً یا فعلاً خلافِ سنّتِ رسولؐ چلتے ہیں اور عقیدہ بھی خلافِ قرآن و سنت رکھتے ہیں۔ یقین کر لو کہ ان کے پاس ایمان کا کوئی نشان نہیں۔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کا یہ اعتقاد ہونا چاہیئے کہ گناہ کا عذاب دیا جائے گا لیکن یہ دائمی عذاب نہیں ہوگا۔ زود یا بدیر وہ دوزخ سے رہائی پا کر جنّت میں ضرور جائے گا۔ اور یہ صرف ایمان کی بدولت ہوگا کہ وہ دائمی طور پر دوزخ میں نہیں رہے گا۔ بلکہ صرف بقدرِ گناہ وہاں رہے گا، اور وہ بھی حالتِ سُکر میں کہ اسے سختی کا احساس نہیں ہوگا۔ اور وہ سُکر ہوگا۔ سُکرِ ایمان، سُکرِ توحید اور سُکرِ اعمال۔ یہ سب کچھ اللہ جلِ شانہٗ کی طرف سے ایک ایمان کی بدولت ہوگا۔ ایمان کو تمام احسن مقامات میں سرداری حاصل ہے اور تمام معاملاتِ حسنہ میں یہ سرفہرست ہے۔ تمام نیک اعمال کی تکمیل ایمان ہی سے ہوتی ہے۔ قرآن و حدیث اس پر دال ہیں کہ اگر کسی انسان نے بھلائی اور انسانیت کے کام اتنے کئے ہیں جتنے بارش کے قطرے مگر اس کے پاس ایمان کی روشنی نہیں تو اس کے تمام نیک اعمال ضبط ہو جائیں گے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اس کے مقابلے میں اگر کسی کے گناہ بارش کے قطروں کی تعداد میں بھی ہوں گے لیکن وہ ایمان کی روشنی رکھتا ہوگا، تو زود یا بدیر جنت میں ضرور داخل کیا جائے گا۔ احادیث میں آتا ہے کہ اگر کسی مسلمان کے پاس ایک ذرہ کے برابر بھی نورِ ایمان ہوگا، تو کبھی نہ کبھی جنت اس کا مقدر ضرور ہو جائے گی۔ سرکش عقل اس فیصلے کو ناانصافی کا عنوان دیتی ہے۔ لیکن اسے اسی دنیا کی مثال سے سمجھنا چاہیئے۔ مثال کے طور پر ایک شخص جس میں ہزارہا

اچھائیاں موجود ہیں اور مخلوقِ خدا اس سے انتہائی خوش ہے۔ وہ لوگوں کی مدد کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا اور اس نے سینکڑوں رفاہِ عامہ کے کام کیے ہیں جس سے مخلوقِ خدا کو بے پناہ فائدہ ہو رہا ہے۔ لیکن وہ شخص حکومت کا باغی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کی ہزار ہا اچھائیاں حکومتِ وقت کے قانون سے اسے بچا لیں گی؟ ہرگز نہیں۔ حکومت کے باغی کو اس کی تمام تر خوبیوں، صلاحیتوں، اور اچھائیوں کے باوصف، وہی سزا دی جائے گی جو حکومت کے کسی بھی باغی کو دی جاتی ہے۔ یہی معاملہ صاحبِ ایمان اور ایمان سے محروم شخص کا ہے۔ محرومِ ایمان، اللہ کا باغی ہے۔ اس کی تمام اچھائیاں اور خوبیاں اسے اس کی بغاوت کے جرم کی سزا یعنی جہنم سے نہیں بچا سکیں گی۔ اللہ ہر مسلمان کو اپنی پناہ میں رکھے!! آمین

پُل صراط

پل صراط ہے جسے احادیث کی اصطلاح میں جسر کہا گیا۔ اور جس کے متعلق قرآن کریم میں یوں آتا ہے اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا (تم میں سے کوئی ایسا نہیں جسے اس پر سے گزرنا نہ پڑے) ہر ایک آدمی کے عمل سے بنتا ہے، مومن کا عمل جتنا وسیع ہو، جتنا مطابق سنت ہو، اتنا ہی پل صراط پر آسانی سے گزر ہو گا۔ اس وقت صرف اپنے ایمان کا ہی چراغ ساتھ ہو گا۔ جس کا ایمان جتنا قوی ہو گا۔ اس کے چراغ کی روشنی اتنی ہی تیز ہو گی۔ اور ہر مومن کے اپنے اپنے ایمان کے درجے کے موافق نور ہو گا۔ اس پل صراط پر صرف یہی نورِ ایمان راستہ دکھا سکے گا۔ اس پل صراط کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہو گا۔ یقیناً ایسا ہی ہو گا مگر صرف ایمان سے محروم لوگوں کے لیے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ بعض لوگ اس پر سے پیدل گزریں گے، بعض گھوڑے پر بیٹھ کر گزریں گے، اور بعض کے گزرنے کی رفتار ایسی ہو گی جیسے براق کی۔ یہ سب کچھ قوتِ ایمانی کے بل پر ہو گا۔ اس پل صراط پر سے گزرنے کی رفتار کا تناسب قوتِ ایمان کے مطابق ہو گا۔ اس دن

روم ایمان کٹ کر نیچے جہنم میں جاگرے گا۔ باسعادت لوگ ہی اس پل کو عبور کر سکیں گے۔
دانائی کا تقاضا یہی ہے کہ اس پل صراط کو عبور کرنے کا سامان کرتا رہے۔ اور وہ سامان صرف
ایمان میں مضمر ہے۔ چاہیئے کہ بندہ تجدید ایمان کرتا رہے جو ذکر اللہ سے
حاصل ہوتا ہے۔ لاریب، افضل الذکر ہے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔
صاحب احتیاط وہی ہے جو دن میں کم از کم اس کلمہ طیبہ کی ایک تسبیح پڑھ کر تجدید ایمان
کرتا ہے۔ بالفرض اس کلمہ کی مداومت کرنے والے شخص کی موت واقع ہو گئی۔ یقینی اور حتمی
طور پر وہ شخص اس کلمہ کی خدمت اور تجدید ایمان کی بدولت قبر میں انوار ایمان کے ساتھ
جائیگا، اور انشاء اللہ تعالیٰ بروز حشر کلمہ طیبہ کی یہی مداومت اسے رسوائی سے بچالے گی۔
ایمان کا ایک پہلو تو موہوبی ہے جو خالصتاً انعام خداوندی سے تعلق رکھتا ہے۔
اور دوسرا کسبی ہے جو بندے کی تصدیق، ایقان، ارادہ، عزم اور قصد سے تعلق رکھتا
ہے۔ تجدید ایمان سے کسبی پہلو میں قوت پیدا ہوتی ہے اور موہوبی طرف سے امداد اور
فضل و کرم آتا ہے۔ دونوں صورتیں سبب تکمیل ایمان ہیں۔ گویا نور ایمان کا تعلق
انسان سے بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت الہادی سے بھی۔ یوں سمجھیئے کہ انسان مذکورہ
بالا دونوں صورتوں کے درمیان ہے یعنی نور قدرت اور نور کسب کے درمیان اور یہ عین فضل و
کرم اور عنایت خداوندی ہے جو بندے کو خاک سے اٹھا کر عرش تک لے جاتی ہے۔
اور اس خاکی چیز کو نور ایمان سے منور کر کے بخشی کی وہ عظمتیں عطا کی جاتی ہیں کہ محروم ایمان
اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایمان کے کیا ثمرات ہیں؟ صرف موت ہی ان پر سے پردہ
اٹھا سکتی ہے۔ مرنے کے بعد مومن اپنے نور ایمان پر نازاں ہو گا اور محروم ایمان کے لیے
قیامت تک حسرت و یاس اور پھر کھلا جہنم۔

برزخ

یہ ایک بہت بڑی دیوار ہے جو پل صراط اور جنت کے درمیان ہے۔ یہی
وہ دیوار ہے جس کی ایک جانب حیات، اور دوسری جانب ممات ہے۔ اس

ہوتا نچلا حصہ تنگ ہے، اور جوں جوں اوپر کو جائیں یہ گنبدی صورت میں وسیع ہوتا چلا گیا ہے۔ بیت معمور بھی اسی کا نام ہے۔ پہلے آسمان سے اس کی ابتدا ہے اور ساتویں آسمان میں اس کی انتہا۔ یہ تو تھا اس کا طول و عرض اور اس کے حدود کا اندازہ اس طرح لگائیے کہ سورج جس کا مقام فلک چہارم ہے۔ اسی برزخ کے گرد چکر کاٹتا ہے اور اس کا مکمل چکر ایک سال میں مکمل ہوتا ہے۔ پورے برزخ میں سوراخ ہی سوراخ ہیں اور ان میں ارواح قیام پذیر ہیں۔ جیسے کہ جنّت کے طبقے ہیں، اور ہر جنّتی اپنے مقام کے مطابق اس میں ہوگا۔ برزخ کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اس میں بھی طبقے ہیں، اور ارواح یہاں بھی اپنے اپنے مرتبے کے لحاظ سے ہوں گی۔ ہر شخص کو مرنے کے بعد یوم حساب تک یہاں ہی رہنا ہوگا، یعنی عالم برزخ میں۔ جو زمین پر قبریں ہیں، یہ ارواح کا مستقر نہیں، ان کا اصل مستقر تو یہی برزخ ہے۔ حساب کتاب کے بعد برزخ سے اپنے اپنے مقام تک چلنا ہوگا۔ ایمان والے خوش نصیب کو جنّت میں اور محروم ایمان بد قسمت کو دوزخ میں جانا ہوگا۔ ایمان کا ثمرہ احاطۂ عقل سے باہر ہے۔

اعمال کی وجہ سے کسی کا ایمان خفیف ہوتا ہے اور کسی کا قوی۔ بعض لوگوں کا ایمان عقیدے کی وجہ سے قوی ہوتا اور بعض کا خفیف۔ عمل میں اگر اخلاص ہے تو عمل نیک ہوگا۔ یہ اعمال ہی کی اونچ نیچ کا نتیجہ ہے کہ زمین سے لیکر عرش تک ایمان ہی کے درجے چلتے چلے گئے ہیں۔

ہر چیز ذی روح ہے

کائنات کی ہر چیز فطری طور پر مومن ہے۔ صرف انسان اور جن کا ایمان اختیاری ہے۔ اور کائنات کی دوسری تمام اشیاء کا غیر اختیاری ہے۔ یہاں ایک چیز یاد رہے کہ ذی روح اور غیر ذی روح کے الفاظ صرف عوام کے لیے ہیں۔ خواص اور بینا لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک ذرہ بھی غیر ذی روح نہیں۔ کنکریوں کا ابوجہل کے ہاتھ میں کلمہ پڑھنا،

درختوں کا رونا اور حکم پر چل کر آنا ، یہ سب اسی کی دلیلیں ہیں ۔

نیّت و عمل

انسان ہو یا جن ، اس کے عمل کا دار و مدار نیّت پر ہے ، عزم پر ہے اور ارادے پر ہے ۔ گویا ہر دو مخلوق نیّت ، عزم اور ارادے پر مامور ہیں ، مکلف ہیں ۔ بندگی کا تقاضا یہی ہے کہ نیت کرکے عمل کرے ۔ اس لیے کہ نیّت کا اپنا علیحدہ ایک ثواب ہے اور عمل کا اپنا ثواب ہے ۔ یاد رہے کہ بغیر عمل کے نیّت کی تکمیل نہیں ہوتی ۔ اور بغیر نیّت کے عمل تشنۂ تکمیل ہے ۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ٹھہرے ۔ اور یہ جو اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ کہا گیا ہے یعنی عمل کا دار و مدار نیّت پر موقوف ہے تو سمجھنا چاہیئے کہ بہت سے نیک اعمال ایسے ہوتے ہیں جو عامل اپنی نیت سے نہیں کرتا ، البتہ وہ اس سے سرزد ہو جاتے ہیں جیساکہ ایک جنبی شخص بارش میں کھڑا رہے اور اس کے سب بدن کو پانی پہنچ جائے ۔ اور وہ بارش ہی کے پانی سے کلی بھی کرلے اور اسی سے کچھ پانی اس کی ناک میں بھی چلا جائے ۔ تو اس کا غسل ہو گیا ۔ اسی طرح کوئی جنبی اگر کنویں میں گر پڑے تو اس کا بھی غسل ہو گیا ۔ حالانکہ اس کی غسل کی نیت نہ تھی لیکن یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ تصحیح عمل ، نیت پر موقوف ہے ۔ اور نیت اور عمل دونوں مل کر ہی کمال عمل بنتے ہیں ۔ مومن کی ذات سے اگر بغیر نیّت کے بھی کوئی اچھا عمل سرزد ہو جائے تو ثواب سے یہ بھی خالی نہ ہوگا ۔ لیکن ایسا عمل اجر میں اس عمل کا مقابلہ نہیں کر سکتا جس میں نیت بھی شامل ہو ۔ یقیناً عمل بندگی کا نشان ہے عبادت کا نشان ہے ۔ اور معلوم ہونا چاہیئے کہ محض نیّت ہی سے حق بندگی ادا نہیں ہوتا جس طرح پانی کے پیئے بغیر پیاس نہیں بجھتی اور کھانے کے کھائے بغیر بھوک رفع نہیں ہوتی ۔ اسی طرح تکمیلِ عمل اسی وقت ممکن ہے جب نیّت بھی خلوص پر مبنی ہو اور عمل بھی ، ایسا اسی وقت ممکن ہے جب نیت و عمل ، اللہ ہی کی خوشنودی اور رضا کے لیے کیا جائے ۔ یہی خالصۃً بندگی ، اور یہی حضوری ہے ۔

عام مشاہدے کی بات ہے کہ انسان سے چھوٹے موٹے گناہ صادر ہوتے ہی رہتے ہیں جبکہ فرشتوں سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوتا۔ اسی طرح نباتات، جمادات وغیرہ سے بھی گناہ سرزد نہیں ہوتا۔ مگر یہ خاص نورِ ایمان کی کرامت ہے کہ مومن اپنے گناہوں کے باوجود فرشتوں پر فضیلت رکھتا ہے، قرآن و حدیث سے اس چیز کی شہادت ملتی ہے کہ فرشتے مومن کے لیے مامور بہ مغفرت ہیں۔ یعنی فرشتے مومن کے لیے مغفرت چاہتے ہیں۔ عافیت چاہتے ہیں اور دارین کی بھلائی چاہتے ہیں یہ صرف ایمان کی برکت ہے جو اللہ تعالیٰ نے تحفتاً مومن کو عطا کی ہے۔ اور اسی نورِ ایمان کی بدولت اللہ تعالیٰ نے مومن کو دوسروں پر فضیلت دی ہے۔ لہٰذا جسے اللہ تعالیٰ فضیلت دے رہا ہو، اس کو کبھی بھی اور کسی بھی رُخ سے برا نہیں کہنا چاہیے۔ ہاں اگر ان میں کوئی چھوٹی یا بڑی برائی دکھائی دے، اس برائی سے تو نفرت جائز ہے لیکن اس برائی کی بنا پر اس کے کرنے والے مومن سے نفرت صریحاً گناہ ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ مومن سے محبت کرنے سے معرفت حاصل ہوتی ہے، معرفت سے محبت پیدا ہوتی ہے اور محبت سے مقبولیت پیدا ہوتی ہے جو عطائے ذاتِ کبریائی ہے۔ ایمانِ صالح بڑی دولت ہے۔ اور اس کے اثرات دارین میں مرتب ہوتے ہیں۔ دونوں جہانوں کی عزت اور نفع صرف ایمان ہی کی بدولت ملتا ہے۔ ایمان کی صرف ایک چنگاری کا یہ مقام ہے کہ اگر تمام کائنات کے اندھیرے مل کر بھی اسے بجھانا اور بے نور کرنا چاہیں تو وہ ایسا کرنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ وقت کسی بھی مومن کے لیے انتہائی مکرم اور معظم چیز ہے۔ ؎

غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عزیز
میرؔ اس کو رائیگاں کھوتا ہے کیا

ایمان حاصلِ تخلیق ہے، اسی لیے حاملِ ایمان خلیفۃ اللہ ہے۔ اور یہی وہ اعزاز ہے جو دیگر مخلوقات میں سے کسی کو حاصل نہیں۔ ایمان ایک سدا بہار نور ہے جبکہ کائنات کی

کوئی دوسری چیز سدا بہار ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ دنیا کی بڑی سے بڑی کامیابی عظمت اور دولت بے یقینی عارضی اور وقتی ہے جبکہ نورِ ایمان زوال کی دسترس سے باہر ہے۔ مومن کی عزت من اللہ ہے اسی لیے ابتداء سے انتہا تک وہ باعزت ہی رہتا ہے لیکن مومن کو بھی لازم ہے کہ روزانہ تجدید ایمان کرتا رہے اور کلمہ طیبہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کی خدمت میں لگا رہے، حال کے لیے کوشاں ہو، توحید پر گزارا رہے، عقبیٰ کی فکر سے غافل نہ ہو، ذاتِ باری تعالیٰ سے غائب نہ ہو، اور ہر وقت یہ دھیان رکھے کہ میں اللہ کو دیکھتا ہوں اور اللہ مجھے دیکھتا ہے۔ اسی کا نام بیداری ہے۔ خواہ نماز میں ہو، خواہ تلاوت میں، خواہ ذکر میں ہو، خواہ فکر میں، خواہ وہ حقوق اللہ کو ادا کر رہا ہو یا حقوق العباد کو۔ اس کا دھیان اللہ سے اِدھر اُدھر نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی مبتدی اللہ کو دیکھنے اور اس پر دھیان جمانے پر قادر نہ ہو تو کم از کم وہ اتنا ضرور دل و دماغ میں بٹھا لے کہ اللہ اس کو دیکھ رہا ہے، اور اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ لیکن بندے کو چاہیئے کہ وہ اس ابتدائی حالت سے جلد سے جلد نکلنے کی کوشش کرے اس لئے کہ خدا کو حاضر و ناظر نہ دیکھنا غفلت کی دلیل ہے، اور بُعد کا ثبوت ہے، اور یہ سببِ عذاب ہے۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمان بھائیوں کو اپنا قرب عطا فرمائے اور دوری کے عذاب سے بچائے!!! آمین

ایمان کہاں ہے؟

سوال یوں ذہن میں آتا ہے کہ ایمان مومن میں ہے؟ یا مومن ایمان میں ہے؟ معلوم ہونا چاہیئے کہ جو ایمان فعلی، ارادی، عازمی، قصدی اور اتفاقی چیز ہے وہ مومن میں ہے۔ اور وہ ایمان جو ازروئے عمل اعتقادی، اعتمادی اور اتفاقی ہے۔ اس میں مومن موجود ہے۔ اس عمل کی پانچ بنیادیں ہیں جنہیں ہم ارکان اسلام کہتے ہیں۔ اور مومن سے جتنے بھی اچھے کام سرزد ہوتے ہیں، وہ سب ایمان کے ثمرات ہیں۔ اس طور مومن اسلام میں ہے۔

اور یہی وہ پانچ ستون ہیں جن پر ایمان کی عمارت قائم ہے۔ گذشتہ اوراق میں ارکان اسلام پر لکھا جا چکا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ان ارکانِ اسلام پر اخلاص کے ساتھ عمل پیرا ہونا مومن کی پہچان ہے لہذا کہا جائے گا کہ ازروئے اعتقاد و ایقان مومن ایمان میں ہے۔ اور ازروئے عمل ایمان مومن میں ہے۔ نورِ ایقان قلب یا باطن میں ہے اور نورِ عرفان قلب ظاہر میں۔ اس کا تعلق اعمال کے ساتھ ہے۔

مومن کے پیشِ نظر ہر وقت اخبارِ الٰہی ہونا چاہیئے اور سنت و شریعت اس کا اوڑھنا اور بچھونا۔ اگر مومن سے کبھی کوئی گناہ حادثاتی طور پر سرزد ہو بھی جائے، تو اسے چاہیئے کہ وہ اللہ کے حضور خود کو اقراری مجرم کی صورت میں پیش کرے اور تہ دل سے توبہ کرے۔ جس طرح ثواب آئینۂ عدل کو جلا بخشتا ہے اسی طرح گناہ آئینۂ دل کو دھندلا دیتا ہے۔ گناہ کے اس دھندلکے کو صرف توبہ سے دور کیا جا سکتا ہے۔ ایمان کا سب سے بڑا کمال نظامی دنیاوی اور تدبیری ہے۔ اس کا اُخروی کمال احاطۂ الفاظ سے باہر ہے اور مومن کبھی عیسائیوں کی طرح ترکِ دنیا نہیں کرتا بلکہ وہ دنیا کو بھی بڑے توازن کے ساتھ لیکر چلتا ہے۔ اسی لیے مومن کی جہاں اور بہت سی صفات بیان کی گئی ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ وہ ایک سوراخ سے کبھی دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔ مومن کے اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان پر اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس پر کلی طور پر بھروسہ کرے اور فاسق و فاجر کو کبھی قابلِ اعتبار نہ سمجھے، یہ ایمان کا نظامی کمال ہے، اور اس کا اُخروی کمال یہ ہے کہ گناہ کرنے کے بعد نادم اور تائب ہو، اور پھر اس گناہ کو کبھی دہرانے کا نہ سوچے۔

مومن کو اپنے کاموں میں اپنے محسنوں سے مشورہ لینا چاہیئے، اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیئے۔ لیکن اس کا تمام تر بھروسہ اللہ رب العزت پر ہونا چاہیئے اس لیے کہ ہر نتیجہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ کیا ہی خوبصورت دعا ہے۔ قُل حَسْبِیَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔

(میرے لیے تو اللہ کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور وہ عظیم عرش کا مالک ہے)

ایمان کا ایک خاصہ یہ ہے کہ وہ تفریق نہیں چاہتا، جدائی ڈالنا اور مومنوں کے درمیان فتنہ اور دشمنی پیدا کرنا ایمان کی ضدیں ہیں۔ مومن تو دو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے جھوٹ تک بول سکتا ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ بھی کسی مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچانے کی خاطر، وہ اپنے شخصی و انفرادی اور دینی و دنیوی فائدے کو بھی قربان کر ڈالتا ہے۔ وہ ایسی قسموں کو بھی توڑ سکتا ہے جس سے مسلمان ہی نہیں بلکہ دیگر مخلوقِ خدا کو ضرر پہنچ سکتا ہو۔ لیکن جو فتنہ ڈالتا ہے۔ خدا اور رسول پر جھوٹ باندھتا ہے، وہ مومن نہیں۔ مسلمانوں میں کسی بھی انداز سے تفریق ڈالنا ایک دوسرے سے متنفر یا برگشتہ کرنا، ایمان اور مومن کی ضدیں ہیں۔ عام طور پر لوگ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں پر فلاں نے کچھ کروا دیا ہے، صریحاً غیبت ہے، بہتان ہے اور گناہ ہے، اور مومن کی صفات کے بالکل برعکس ہے۔ مومن تو اپنے بھائی کے لیے کبھی بھی وہ چیز پسند نہیں کرتا جو اُسے خود ناپسند ہو۔ اور مومن کے یہاں تو ایثار ہی ایثار ہے۔

مومن کا ایک اور اعلیٰ و ارفع انعام یہ ہے کہ مومن کی موت پر دوسرے زندہ مومن دور و نزدیک سے جمع ہو کر اس کی نمازِ جنازہ میں شمولیت اختیار کرتے ہیں، بالفاظِ دیگر اس کے لیے اللہ سے مغفرت مانگتے ہیں، جس کے نتیجے میں مردہ مومن کی تقصیروں کو معاف یا کم کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کی نیکیوں میں اضافہ کر کے اس کے درجات بڑھا دیئے جاتے ہیں۔ ہر چند کہ مرنے کے بعد مردہ دارالعمل سے نکل کر دارالجزا میں چلا جاتا ہے۔ وہ اگر ایک سجدے کی بھی خواہش کرے اور مہلت چاہے تو اس کو اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ مگر عنایتِ الٰہی تو دیکھو اور برکتِ ایمان ملاحظہ فرمائیں کہ

مومن کے لیے دعائے مغفرت کرنے والے دوسرے مومنوں اور محسنوں کی ایک جماعت پیدا کر دی جاتی ہے جو اس کے نیک اعمال میں مرنے کے بعد بھی اضافے کا سبب بنتی رہتی ہے۔ یہ تو ہے عنایت خاص۔ اب عنایت عام پر نظر کیجیے کہ درج ذیل دُعا کو جزو نماز بنا دیا گیا۔ اور جب تک اس زمین پر ایک نماز پڑھنے والا شخص بھی موجود ہے۔ ہر ایمان لانے والے کے گناہوں میں تخفیف ہوتی رہے گی اور ثواب میں قیامت تک اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ غور کیا جائے تو ایمان کا یہ ثمرہ عظیم ہے۔ دُعا یہ ہے :

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ ۝

اے ہمارے رب! ہماری بخشش فرما دیجیے۔ اور مجھے، میرے والدین اور مومنین کو بخش دیجیے جس دن کہ حساب ہوگا۔

اندازہ لگائیے کہ ایمان کتنی بڑی چیز ہے، اور کتنی بڑی دولت ہے کہ قیامت تک زندہ مومن اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے چلے جائیں گے۔ علاوہ ازیں قرآن و حدیث اس بات کے شاہد ہیں کہ مومن کی موت پر زمین و آسمان بھی روتے ہیں۔ ایمان کیا ہے؟ بندے کو اللہ سے ملانے کا نام ایمان ہے۔ جاننا چاہیئے کہ مومن کے لیے قبر کی وسعت مشرق سے مغرب تک ہوتی ہے جبکہ محروم ایمان کی تنگیٔ قبر (عالم برزخ) میں اسے پیسے رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت خاص سے ہر مسلمان بھائی کی قبر کو کشادگی عطا فرمائے۔

قدیم کے معنی

قدیم، قدم سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں ہمیشہ سے ہونا اور ہمیشہ رہنا۔ اسی لیے جو چیز ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے، فقط اسی کو قدیم کہتے ہیں، یہ صفت فقط اللہ رب العزت اور اس کی صفات کے ساتھ مختص ہے۔ اور کائنات کی کوئی مخلوق ایسی نہیں جس پر اس لفظ قدیم کا اطلاق ہو سکے۔

ذہن انسانی میں کبھی کبھی یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور

چیز ہمیشہ سے موجود نہیں تھی تو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان اور اس میں تمام چیزیں کیسے بنا ڈالیں؟ معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام عالم کو اپنے حکم "کن" اور اپنی قدرت سے پیدا کیا۔ حق یہی ہے کہ اسے عالم کے بنانے اور زمین و آسمان کے قائم کرنے میں، کسی چیز کی حاجت نہیں تھی۔ کسی اور کی معاونت کی ضرورت نہیں تھی۔ کسی اور سے مشورے کی محتاجی نہیں تھی۔ کیونکہ بالفرض محال اگر اللہ تعالیٰ تخلیقِ عالم میں کسی کا محتاج ہوتا تو پھر نہ وہ اَحَدْ ہو سکتا تھا اور نہ واجب الوجود اور جب کہ وہ لاریب اَحَدْ بھی ہے اور واجب الوجود بھی۔ تخلیق کا مادہ انسان ہی میں موجود ہے۔ اور انسان ہی اپنی تخلیق کے لیے اللہ کی تخلیق کردہ صفات اور کائنات کا محتاج ہے۔ لیکن اللہ اپنی تخلیق میں کسی اور کا کسی طور محتاج نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالقِ تام ہونے کا دعویٰ فقط اللہ ہی کو زیب دیتا ہے۔ رہی بات اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی صفاتِ کمالیہ کی تو اس ضمن میں اتنا کہنا ہی کافی ہو گا کہ وحدت، قدیم، وجوب، وجود، حیات، قدرت، علم، ارادہ، سمع، بصر، کلام، خلق اور تکوین وغیرہ اس کی صفاتِ کمالیہ سے ہیں۔

اس طرح ازلی اور ابدی کا مسئلہ ہے۔ جس چیز کی ابتدا نہ ہو یعنی وہ ہمیشہ سے ہو، اُسے اَزلی کہتے ہیں اور جس چیز کی انتہا نہ ہو یعنی وہ ہمیشہ رہے، اسے اَبدی کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے اللہ ہی اَزلی ہے اور اللہ ہی ابدی، اور قدیم ہونے کے بھی یہی معنی ہیں۔

لگے ہاتھ حیاۃ کے معنی بھی متعیّن کرتے چلیں۔ حیات کے لیے ہماری لغت میں لفظ زندگی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اس کے معنی پھر یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ زندہ و پائندہ ہے۔ اور وہ اس شان کے ساتھ زندہ ہے کہ موت یا فنا یا شکست و ریخت نام کی کوئی چیز اس کی حیاۃ کے قریب نہیں پھٹک سکتی۔ قرآن و حدیث سے اللہ

کے لیے صفتِ حیاۃ ثابت ہے۔

اسی طرح "صفتِ قدرت" کے معنی کا تعین ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ قدرت کے معنی طاقت کے ہیں۔ اس طور کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ عالم اور جو کچھ اس میں ہے، کے پیدا کرنے، اسے قائم رکھنے، اس کی پرورش کرنے، اس کو رزق پہنچانے اور ایک مدتِ مقررہ کے بعد اسے فنا کرنے اور پھر از سرِ نو موجود کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ جو اللہ تنہا و یکتا اس کائنات کا نقشِ اول نیستی سے ہستی میں لا سکتا ہے کیا وہ اسی نقش کو مٹا کر اسے دوبارہ نہیں ابھار سکتا؟ عام دنیاوی معاملات میں اگر دیکھا جائے تو نقشِ اول ہی مشکل ہوتا ہے۔ یہ تو انسان کی بات ہے۔ اللہ کے لیے تو کوئی بھی چیز مشکل نہیں۔

ذرا لفظ "ارادہ" پر بھی غور کرتے چلیں۔ ارادہ کا معنی ہے اپنے اختیار سے کام کرنا یعنی اللہ تعالیٰ جس چیز کو چاہتا ہے، اپنے اختیار سے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے اپنے اختیار سے معدوم کر دیتا ہے۔ دنیا میں تمام باتیں اسی کے اختیار اور ارادے سے ہو رہی ہیں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ چونکہ ہر مقام پر اللہ ہی کے ارادے کو دخل ہے لہٰذا انسان مجبورِ مطلق ہے اور اس لیے انسان کے لیے دعا مانگنا نہ مانگنا اور عبادت کرنا نہ کرنا ایک ہی ہے۔ ہمیں ایسا نہیں سوچنا چاہیے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ خود کہتا ہے کہ مجھ سے مانگو، میں تمہیں نامراد نہیں کروں گا۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان اس سے کوئی ایسی چیز مانگے جو بالآخر اس کے لیے ہلاکت خیز ہو، یقیناً وہ اپنی صفتِ رحمانیت کے پیشِ نظر اس کو یہ ضرر رساں چیز نہیں دے گا، بلکہ اس کی جگہ اسے کسی ایسی چیز سے نواز دیگا جس میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے۔

اسی طرح وہ سمیع ہے اور ہر ممکنہ چیز اس کی سماعت کی پہنچ میں ہے۔ لیکن اس کی سماعت ایسی ہرگز نہیں جیسی انسان کی، پھر اس کی سماعت کان یا کسی اور چیز

کی محتاج نہیں ۔ وہ دیکھتا ہے مگر اس کی بصارت و بصیرت انسان کی بصارت و بصیرت سے مختلف ہے اور اس کی بصارت آنکھ کی محتاج نہیں ۔ ایسے ہی وہ کلام بھی کرتا ہے مگر وہ کلام کرنے میں زبان یا کسی اور چیز کا محتاج نہیں ۔

اسی طرح وہ خلق بھی کرتا ہے اور تکوین بھی ۔ لیکن جس طرح وہ تخلیق کرتا ہے اور جس طرح وجود عطا کرتا ہے ۔ وہ انسانی طرزِ تخلیق اور طرزِ تکوین سے قطعی مختلف ہے ۔

مندرجہ بالا صفات کے علاوہ بھی اللہ کی بہت سی صفات ہیں جیسے مارنا ، زندہ کرنا ، رزق دینا ، عزت دینا ، ذلت دینا وغیرہ ۔ ایک بات یاد رہے کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کی تمام صفات ازلی و ابدی اور قدیم ہیں ۔ اور ان میں کسی کمی بیشی یا تغیر و تبدل کا امکان نہیں ۔

دین کے تین ستون

ایمان ، اسلام اور احسان ۔ دین کے تین ستونوں کا مقام رکھتے ہیں ۔ ایمان اعتقادی کام ہے ۔ اخلاصِ دل سے ، اخلاصِ نیت سے ، ارادہ قلبی سے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کو ایک ماننا ، اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو جملہ احکام الٰہی کا ایک کلی مجموعہ اور مظہر ماننا ، وہ تمام احکام الٰہی جو قرآن و سنت کے واسطے سے ہم تک پہنچے ، کلیتہً برحق ہیں ۔ گذشتہ اوراق میں ارکان اسلام کے عنوان سے تفصیلاً لکھا جا چکا ہے ۔ بہر حال پانچ ارکانِ اسلام پر عملی طور پر عمل پیرا ہونے اور قرآن و حدیث میں بیان کردہ احکام الٰہی پر عمل کرنے کا نام ہی اسلام ہے ۔

احسان کیا ہے ؟ دین کے صحیح صحیح خطوط پر معیارِ محمدی کے مطابق زندگی کو ڈھال لینے کا نام " احسان " ہے ۔ وہ لوگ جو دین کو صرف ایک قانونِ حیات تک ہی محدود نہیں سمجھتے بلکہ تقرب و رضائے الٰہی کا ذریعۂ اعظم سمجھتے ہیں ، صرف وہی صاحبِ احسان ہیں ۔ طالبِ حق کو جس طرح اپنی ہستی کا علم اور یقین ہوتا ہے ، اسی طرح کا علم اور یقین اسے اپنے خالق و مالک کا بھی ہوتا ہے اور یہی وہ علم و یقین ہے جس سے

حضوری حاصل ہوتی ہے۔ اور اس مقام حضوری ہی کا نام تو احسان ہے۔ اور یہی "احسان" ہے جس کے متعلق یوں کہا گیا ہے کہ "اللہ تعالیٰ کی ایسی عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس پر قادر نہیں تو کم از کم تمہارے پیش نظر اتنا تو ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ لہذا بندے کو چاہیے کہ وہ اپنے قول و فعل میں اخلاص پیدا کرے۔ اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جاننے کی پہچان ہی یہی ہے یہی احسان ہے یہی تکمیل ایمان ہے یہی تکمیل احسان ہے یہی مبداءِ ذوق ہے یہی ذوقی ایمان ہے یہی ذوقی اسلام ہے یہی ذوقی احسان ہے۔

ذوق کیا ہے؟ یہ ایک تاثیر ہے ایک مستی اور ایک کیفیت ہے۔ جو کسی بھی عاشقِ صادق میں شرابِ عشق (حظِ عبودیت) پینے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک کیفِ عجیب ہے۔ جو ارادہ و قلب تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ ایک ایک مسام کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ طالبِ حق اس مقام پر از خود رفتہ ہو جاتا ہے۔ اس پر بیخودی کا ایک خمار سا پر افگن ہو جاتا ہے اور وہ ایک ناقابل بیان وجد میں چلا جاتا ہے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ ذوق مشاہدۂ حق کا نقشِ اوّل ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کی کتاب میں برکت ہے، احکام میں برکت ہے، تعمیل میں برکت ہے، اس کی ذات میں برکت ہے، اس کی صفات میں برکت۔ اسی طرح کلام الٰہی کے ایک ایک لفظ میں برکت اور تاثیر ہے۔ قرآن کی حفاظت اور اس کا ادب و احترام ہم سب پر فرض ہے۔ یہاں تک کہ قرآن کریم کے پھٹے ہوئے اور بوسیدہ پرزوں کی توقیر و تعظیم ہر مسلمان پر فرض کا مقام رکھتی ہے۔ بعض لوگوں کو تو ولایت ہی صرف اس سبب سے ملی کہ وہ زمین پر کسی بھی لکھی ہوئی تحریر کو برداشت نہیں کر پاتے تھے، اس چیز کے پیش نظر کہ کہیں اس پرزہ کاغذ پر کوئی قرآنی آیت یا حدیث کے الفاظ تحریر نہ ہوں۔ علاوہ ازیں اگر کچھ بھی نہ ہو تو کم از کم وہ حروف تو موجود ہوتے ہیں۔

جو کتاب اللہ اور حدیثِ رسول میں استعمال ہوئے ہیں۔ یہی انتہائے ادب انھیں بے چین کئے رہتا تھا، اور وہ زمین سے ایسے لکھے ہوئے کاغذوں کو بھی اٹھا لیتے جن پر غلاظت لگی ہوتی۔ انھیں نہر یا دریا پر لے جا کر اس حد تک دھوتے کہ حروف مٹ کر کاغذ صاف رہ جاتا۔ یقین کرو کہ جس بدبخت نے قرآن کا اس کے الفاظ کا اس کی عبارت کا اس کی سیاہی یا اس کے کاغذ کی عزت نہ کی اُس کا ایمان ضعفِ مسلسل کا شکار رہوا۔ اور اللہ معاف فرمائے یہ ضعفِ ایمان بعض اوقات اس حد تک بھی بڑھ جاتا ہے کہ ایمان کلیۃً معدوم ہو جاتا ہے۔ گویا یہ ادب ہی ہے جو تقویتِ ایمان کا باعث بنتا ہے اور اسی سے فضلِ الٰہی جیسی نعمتِ عظمیٰ حاصل ہوتی ہے۔ تارکِ ادب محرومِ فضلِ الٰہی ہے۔ ع

بے ادب محروم شُد از فضلِ رب (مولینا رومؒ)

ہر قسم کی عبادت ادب ہے۔ کائنات کا ایک ایک ذرہ ادب کو ملحوظ رکھتا ہے۔ البتہ کچھ بدقسمت انسان اور تیرہ بخت جو اس سعادتِ عظمیٰ سے محروم ہیں۔ کاش کہ ان کے دل و دماغ میں یہ بات اتر جائے کہ اللہ ہی وحدہٗ لاشریک ہے اور بالآخر اس کے روبرو پیش ہونا ہوگا۔ یہ چیز اس وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان کا موت پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے جتنا زندگی پر اور وہ موت کو اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح زندگی کو۔

انسان کی انسانیت کا دار و مدار علم، عمل اور ادب پر منحصر ہے۔ کیونکہ ان تینوں صفات کے بغیر انسان حیوان سے بھی بدتر ہے۔ ہمارے دَور کا انسان ہے۔ یہ تو منزل کا راستہ ہی کھو بیٹھا ہے۔ اور گمراہی کے جنگلوں کی بھول بھلیوں میں گم ہے۔ بھلا ان گم کردہ راہِ منزل کی کیا انسانیت اور کیا قدرِ انسانیت؟

علمِ صالح حاصل کرنا چاہیے کہ اس سے احکام معلوم ہوتے ہیں۔ اور ادب سے نفس کی عاجزی، نفس کی ذلت، نفس کی فقیری، نفس کی ضعیفی، نفس کی مسکینی معلوم ہوتی ہے۔ اور نفس کے معنی اس وقت تک نہیں کھلیں گے جب تک ادب کا راستہ اختیار نہیں کیا جاتا۔

اور اعمال سے قربِ الٰہی، رضائے الٰہی اور اطاعتِ الٰہی کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔ جس انسان کے پاس علم نہیں، ادب نہیں اور عمل صالح نہیں، وہ دیگر جانوروں سے بھی گیا گزرا ہے، اس لیے کہ انسان احکام الٰہی کا مکلّف ہے اور وہ نہیں ہیں۔ افسوس صد افسوس کہ آج جس طرف بے راہ رو معاشرہ اسے لئے جا رہا ہے، وہ بے چون و چرا اسی طرف چلا جا رہا ہے۔ بدی اس دور کا فیشن اور نیکی اس دور کی متروک چیز بن کر رہ گئی ہے۔ آج کا معاشرہ برائی کو اس طرح کھول کر بیان کر رہا ہے اور اس پر ایسا فخر کر رہا ہے کہ نیک لوگ یہ انداز اپنی انفرادی اور شخصی نیکی پر بھی روا نہیں رکھتے۔ آج کے لوگوں کی بھاری اکثریت صرف ہیئتی اور صوری لحاظ سے انسان ہے لیکن عملاً بدتر از حیوان۔

اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سب سے زیادہ خوبصورت انسان کو بنایا اور جب یہ احسنِ تقویم انسان اپنے اندر اعمال کی شمع روشن کر لیتا ہے تو اس کے حُسن کو دوام حاصل ہو جاتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں وہ باعثِ آشفتگیٔ طبعِ جہاں بن جاتا ہے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ عمل کا حسن علم سے ہے اور علم کا حُسن ادب سے۔ ادب کے بغیر بدنصیبی ہی بدنصیبی ہے اور فضلِ رب میں اس کا کوئی حصّہ نہیں۔

تمام جہان میں منظور عمل، عملِ تہذیب ہے۔ عربی زبان میں تہذیب کا ایک معنی سونا بنانا بھی ہے۔ انسان واقعی سونا بنا سکتا ہے تاوقتیکہ وہ علمِ صالح، ادب، تقویٰ، اخلاص نیت، ترکِ دُنیا (لیکن یہ ترکِ دُنیا عیسائیوں کے ترکِ دنیا کے تصوّر سے مختلف ہے)، ترکِ بُغض اور خیر خواہیٔ مخلوق کی مدد سے اکسیر تیار کرے، لقمۂ حلال معدے میں ڈالے اور تنہا اللہ رب العزت پر تکیہ کرے، پھر وہ جس پر بھی خط کھینچ دے گا، اسے کندن بنا ڈالے گا۔ اللہ پاک سب مسلمان بھائیوں کو ادب کی دولت سے مالا مال کرے!! آمین۔

ادب بھی دو قسم کا ہے، ایک نظامی ہے اور ایک مذہبی۔ نظامی ادب وہ ہے جو ایک دوسرے کی تعظیم کرنا سکھاتا ہے۔ اور مذہبی ادب یہ ہے کہ احکام خداوندی

کا خیال رکھنا، احترام کرنا اور ذاتِ اقدس سے محبت رکھنا اور رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر اپنی زندگی کو ڈھالنا، اور اس پر مداومت اختیار کرنا، یہی مذہبی ادب ہے۔ اس سے انسان کے اندر رقت، اخلاص، ذوق اور شوق پیدا ہوتا ہے، جو محبوبِ حقیقی تک رسائی کا ذریعہ ہے، یہی آدابِ خداوندی ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر حسرت ہی حسرت اور خسارہ ہی خسارہ ہے۔

مومن اور مسلمان پر مزید گفتگو

مومن وہ ہے جو اللہ تعالیٰ، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور احکام خداوندی کو مانتا ہے اور عمل میں لاتا ہے (یہ دوسری بات ہے کہ اس سے کبھی کبھار عمل میں کوتاہی بھی ہو جاتی ہے) اور مسلمان وہ ہے جو شریعت کے احکامات کو اپنے عمل میں رکھتا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ اس کا علم کم ہو لیکن یہ ممکن نہیں کہ اس کا علم، عمل سے خالی ہو۔ اس کا عمل کبھی خلافِ سنت نہیں ہوتا۔ وہ بدعت سے متنفر ہوتا ہے لیکن بدعتیوں سے نہیں۔ وہ حتی المقدور ان بدعتیوں کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ خود کو کبھی افسر یا حاکم نہیں سمجھتا وہ صرف اتباع رسولِ مقبول میں حق بات پہنچانے کا قائل ہے۔ اور بات زبردستی منوانے کا قائل نہیں۔

لگے ہاتھ بدعت کے معنی بھی متعین کرتے چلیں۔ اسلام میں کسی ایسی نئی چیز کا اضافہ جو اس کا قطعی طور پر جز نہ ہو۔ اس نئی چیز کو اسلام کہہ کر اسلام میں داخل کرنے والا خلافِ عبادت کو عین عبادت اور خلافِ دین کو عین دین سمجھتا ہے۔ اس وجہ سے بدعت ایک بدترین گناہ ہے۔ کیونکہ اس کا مرتکب گناہ کو عین ثواب سمجھ کر کرتا ہے اس کے اس گناہ سے تائب ہونے کی توقع قریب قریب معدوم ہوتی ہے۔ اللہ اپنی پناہ میں رکھے اور بدعت سے نا آشنا رکھے!! آمین

رہی بات دین کی تو دین وہ اساس یا بنیاد ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ

کے ذریعے ہمارے لیے فراہم کیا ہے۔ دین میں اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ دین میں کمی بیشی کرنا کسی طور جائز نہیں۔ معلوم ہونا چاہیے کہ ایمان اعتقادی، اسلام عملی اور احسان حضوری ہے۔ ایمان کا اصل کام یہ ٹھہرا کہ طالبِ حق اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاضر و ناظر دیکھے۔ یہی وہ طریق ہے جس سے دل میں حق سے محبت اور باطل سے نفرت جاگزیں ہوتی ہے۔

فقہ اسلامی کے عین مطابق زندگی گزارنا محمود اجتہاد ہے۔ اور بدعت ہمیشہ فقہ اسلامی کی مخالفت کی پاداش میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔ فقہ کے مطابق پوری زندگی کو ڈھالنا آسان تو نہیں۔ مگر ہر مسلمان کے لئے اپنی زندگی شریعتِ محمدیؐ کے مطابق گزارنا ناگزیر ہے۔ احکامِ شریعت پر عمل جزوِ ایمان ہے۔ اس سے کسی لمحہ بھی مفر نہیں ہونا چاہیے۔ اسی میں انسانی معراج ہے۔ یقیناً تمام روحانی مقامات صرف اسوۂ رسولِ مقبولؐ پر مداومت کے انعامات ہیں۔

(تمّت بالخیر)

ادارہ بلاغ الناس